نتھ کا غرور

حیدر آباد کی بے باک کہانیاں

واجدہ تبسم

شمع بک ڈپو
آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ان افسانوں کے تمام کردار، مقامات، واقعات اور ادارے فرضی ہیں اور ان کا کسی شخص، جگہ، واقعہ یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کسی فرد، مقام یا ادارے سے مطابقت قطعی اتفاقیہ ہے اور اس کے لئے مصنف یا پبلشرز کسی طرح کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے۔

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت : تیس روپئے (Rs. 30)

جملہ حقوق طبع و نقل و ترجمہ بحق پبلشرز محفوظ ہیں، کسی طرح بھی اس کے کسی حصہ کی اشاعت، ترجمہ یا کسی طرح استعمال سے پہلے پبلشرز کی تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صرف نقاد حضرات تنقید میں کچھ حصہ نقل کر سکتے ہیں۔
پاکستان میں اشاعت کے حقوق ادارہ روپ پبلشرز، ۱۱۴۱-ایف۔ پی۔ آئی بی کالونی، کراچی کے نام محفوظ ہیں۔ بلا اجازت شائع کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

دوسری بار دو ہزار مارچ ۸۴ لاہوتی فائن آرٹ پریس۔ دہلی

"ہل"

"اے لو ماں بارات آگئی ہے ——"

"اے دولہا آگیا —— چلو نگی سے ——"

باہر باجوں کی تیز تیز آوازوں کے ساتھ، اندر زنان خانے میں لڑکیوں اور عورتوں کا شور بھی رَل مِل گیا۔ سب کی سب ایک بھرا مار کر دُولہن کو چھوڑ کر چاندنی کی طرف بھاگیں۔

"ائی ہلّو ہلّو چلو جی ماں ——" کوئی بچوں والی عورت بیزار سی آواز میں بولی، "اُجاڑ چوتھی بار دولہا بنے، سو دُولے کو دیکھنے کی ایسی بھی کیا ماری پڑی ہے ——"

دُلہن کا دِل اپنی جگہ ڈوب کر رہ گیا۔

یہ بات نہیں کہ اُسے اس لمحے سے پہلے تک اس بات کا علم نہ ہوا ہو کہ وہ ایک ایسے شوہر کی بیوی بن کر جا رہی تھی جس کی آگے ہی ایک نہ دو، تین تین

بیویاں موجود تھیں ——— لیکن اس کی اپنی تو پہلی شادی تھی نا ——— ؟ گھر میں جب کبھی یہ ذکر ہوتا وہ انجان سی بن جاتی ——— اسی لئے آج سے پانچ دن پہلے جب اسے پیلے کپڑے پہنا کر مایوں بٹھایا گیا تھا اور گھر میں لڑکیوں بالیوں کی دھوم اور رَول مچ رہی تھی تو وہ جان بوجھ کر سر درد کا بہانہ لے کر لیٹ گئی تھی تاکہ یہ شور شرابہ اس کے کمرے سے دور ہو جائے جس میں رہ رہ کر کوئی نہ کوئی عورت سرگوشیوں میں، یا کوئی حماقت سے، زور زور سے ہی پوچھنے لگتی: "ہو جی بولتے دولت نواب کی یہ چوتھی شادی ہے اِنے ———"

کسی کو جواب ملتا "اُجاڑ تم کو اتی پنچایت کائے کو جی ——— ہوئیں گی سو ہوئیں گی، تمہارے پیٹ میں کائے کو سُول اُٹھ رہا ———"

کسی کو جواب ملتا "ہو ہے تو ——— پن معلوم بھی ہے کی اُجاڑ دولت کتی ہے؟ عمر بھر سونے چاندی میں کھیلتی رہیں گی ———"

"ہو جی تو سنے چاندی کے بدلے میں اولاد کو بیچ دیتے رہتے کیا؟"

"تمہارے آنگ میں کائے کو آگ لگ رئی جی بول کے ...."

دولہن کے دل سے دھواں سا اُٹھنے لگا ——— مانجھے مایوں سے پہلے سے ہی، جب سے یہ شادی ٹھہری تھی، یہی بول سنتے سنتے اس کا کلیجہ کچا ہو گیا تھا، لیکن بولتی بتاتی کس سے ——— ؟ معمولی سے متوسط گھرانے کی خوب صورت سی لڑکی جس نے کسی اسکول کی سہیلی کی شادی میں ذرا جگر مگر کرتے کپڑے پہن لئے تھے اور یونہی بے تکا سا سنگھار کر کے، بال گیلے تھے تو ذرا ڈھیلی سی چوٹی گوندھ لی تھی، اور شادی گھر کی اُجلی اُجلی چاندنیوں اور مسندوں پر اُلٹی پھر رہی تھی ——— پتہ نہیں کس رشتے ناطے سے نواب دولت یار جنگ کا خاندان بھی اس شادی میں آیا ہوا تھا۔

ساروں کی نگاہوں کا مرکز وہ لمبی سی ناگن تھی جس نے اب تک تو کسی کو نہیں ڈسا تھا، لیکن زبان لپ لپاتی یہاں وہاں گھوم رہی تھی ـــــ جلوے اور آرسی مصحف کے وقت جب زنانہ مردانہ ایک ہی ہال میں ٹوٹا پڑ رہا تھا تو آئینے کی پکار مچی کہ دولہن دولہا کو اس میں ایک دوسرے کا موہنہ دکھایا جاتا تھا ـــــ صابرہ جب آئینہ لینے دوسرے کمرے کو لپکی تو اتفاق سے دولت یار جنگ دوسرے دروازے سے داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے صابرہ کی صرف پیٹھ دیکھی جس پر ایک ناگن جھول رہی تھی ـــــ جھوم رہی تھی۔

"باپ رے! اِتّے بڑے بالاں تو ہم خواباں میں بھی نئیں دیکھے ـــــ" وہ ہنس کر بولے۔

بڑی پاشا اُن کے بازو ہی تھیں ـــــ یوں جیسے بچہ کسی چیز پر لپکے اور ماں فوراً دلا دینے کو تل جائے، پیار سے بولیں: "ائی ماں بیٹے کو بالاں پسند آگئیں چھوکری کے ـــــ کرتا شادی ـــــ؟"

"جی نئیں ـــــ" وہ گھبرا کر بولے: "ہم اُس انداز سے نئیں بولے۔ بس سچی بات تھی موہنہ سے نکل گئی ـــــ"

"ائی تو کیا ہوا ـــــ اُجاڑ نسل چلانے والا کوئی تو ہونا ـــــ"

دولت یار جنگ کی تین تین دلہنیں تھیں ـــــ اولاد ایک سے بھی نہیں تھی۔ بڑی دلہن سگے ماموں کی بیٹی تھیں ـــــ بچپن سے منگی ہوئی ـــــ اب اولاد تو اللہ کی دین ہے۔ پھر کسی دوست کی شادی میں گھم گھم ناچتی ایک پاتر پہ دل آگیا ـــــ عقد پڑھوا لیا۔ ماں نے تو کچھ نہ کہا ـــــ بڑے نواب بگڑے، لیکن نوابوں میں اور پیسے والوں میں موہنہ کا مزہ بدلنے کو دو چار عورتیں کر لینا ایسی کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی، سو چپ ہو رہے۔ ہاں اتنی قید البتہ ضرور

شادی نہ وہ ناپن ہمارے باپ دادوں کے وقت کی عزت دار حویلی میں نتیس آنا بول کے ــــ،،

وہ الگ ایک حویلی میں رہتی تھی۔ اور نواب دولت یار جنگ کا زیادہ وقت اسی کے پاس اور اسی کے ساتھ گزرتا تھا ــــ ویسے اِدھر اُدھر مہینے میں چار پانچ بار اور چکر جگ لیتے۔

پھر تیسری تھیں جو اماں جانی کی ضد پر، کہ پوتا کھلانے کی آرزو میں ہر دن گور سے قریب اور گھر سے دور ہوئی جارہی تھیں، بے حد دھوم دھام سے بیاہ کر لائی گئی تھیں۔ بھائی سے ابی مارے عمر بھر کے تعلقات ٹوٹ سے گئے، مگر بڑی دلہن بھی ایسی میاں کی دیوانی تھیں کہ دھڑا دھڑ سوکنوں پہ سوکنیں چلی آرہی تھیں لیکن میاں سے بدظن ہونے کا نام نہ لیتیں۔

اور آج تو انہوں نے غضب کردیا تھا ــــ چھوٹی دلہن کا پورا ساج سنگھار اپنے ہاتھوں کیا تھا اور ابھی بارات آنے کی ہلڑ سے پہلے گھونگھٹ میں مونہہ ڈال کر بڑے پیار سے کہہ رہی تھیں: "میں دیکھو تم نا سجانے سنوارنے سب سے پہلے اِچ آگئی۔ اب عقد خوانی کے بعد اپنے ہاتھاں سے تمہارے گلے میں کالی پوت کا لچھا پہناؤں گی بول کے ــــ ڈیوڑھی کو تم تو بھی ایک آدھ وارث دینا ماں ــــ ہم لوگاں تو خالی ہاتھ، خالی گودی کے اِچ رہے۔" پھر رک رک کر بولیں "ہور اب تو ہاتھ بھی نہیں لگاتے ــــ،، صابرہ کا دل جو پہلے ہی ڈوبنے ڈوبنے کو ہو رہا تھا، بالکل ہی ڈوب کر رہ گیا۔

شادی کی خوشی کیسی ہوتی ہوگی ــــ؟ شادی تو ہو رہی تھی، لیکن ایسی شادی کی خوشی جو کورے اور کنوارے مرد سے ہوتی ہوگی!!

"امنی تمہارے گھر میں کھٹی دال چاول کھانے کو بھی ہیں اُتی اِچ خوش تھی جتنا

لوگاں مرغیاں ہور بریانیاں کھا کو رہتے ہوئیں لے۔ پھر ہم کائے کو میرا ایسا دین
نکالا کرے ——؟؟"

دولت نواب کی طرف سے پورے چاؤ چونچلے، پہلی شادی کی طرح ہو رہے تھے۔ آرسی مصحف بھی ہوا، چاول گنانے کی رسم بھی ہوئی —— ریشمی پاجامے میں ازار بند ڈالنے کی رسم بھی ہوئی۔ دُودھ سے پیر بھی دُھلائے گئے۔ لیکن صابرہ کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ سُسرال، جگمگاتی ہوئی ڈیوڑھی اور سجے سجائے کمرے میں کیسے پہنچائی گئی۔

ہوش تو اُسے جب آیا، جب ہنستی، فقرے کستی، سُسرال کی عورتیں اور لڑکیاں دُولہا میاں کو کمرے میں دھکیل کر باہر سے دروازہ بھیڑ کر چلی گئیں اور وہ ڈری سہمی، سر جھکائے ہر ہر پل اور لمحے کا حساب کرتی رہی کہ اب چوتھی بار دُولہا بننے والا مرد کس طرح اس کے سوتے ہوئے مُردہ احساسات کو جگاتا ہے —— لیکن یہاں بھی اس کے نصیب میں وہی کھٹی دال اور چاول لکھے ہوتے تھے۔

وہ آرام کُرسی پر کچھ لیٹے کچھ بیٹھے جھکولے کھاتے رہے۔ پھر عجیب بے حسی سے بولے: "تمہارے لمبے بالاں ہمارے جی کا جنجال بن گئے حضت"

وہ حرکت بھی نہ کر سکی۔

وہ پھر گویا ہوئے: "تم بُرا نئیں ماننا —— ہمارا دِل چھوٹی حویلی میں زیادہ لگتا بول کے —— اب اماں جانی کی خوشی تھی بول کے ہم نے نکاح پڑھا لئے۔ یہاں آ بھی گئے، پر اب ہم تھوڑی دیر آرام کر کو چھوٹی حویلی کو چلے جائیں گے۔"

وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔

"ہم اتنا ضرور بول رئے ہیں کی تم نا اس ڈیوڑھی میں کوئی تکلیف نئیں ہوئیں کی —— ہم کیا کرنا —— نہ دِل ہمارے بس کا ہے نہ اولاد —— دِل چھوٹی حویلی

کسی ستارہ کے پاس ہوتا، ہو۔ اولاد خدا کے ہاتھ میں ——— وہ مالک دینے والا ہوتا تو تین تین میں سے کسی ایک سے تو دیتا، مگر ہم کو لگتا کی اولاد کی خوشی ہمارے مقدر میں اچ نئیں ———"

وہ دھیرے دھیرے آنسو بہاتی رہی ——— رات گئے وہ چوروں کی طرح اٹھے۔ اِدھر اُدھر جھانک کر اطمینان کیا کہ سب رشتے دار سو چکے ہیں، سارے میں سوتا پڑا ہے۔ کچھ نوکر چاکر کام کاج میں مصروف ہیں، کچھ آڑے ٹیڑھے یہاں وہاں ادھ مرے پڑے ہیں ——— پچھلے دروازے سے نکل کر سائیس کو جگا کر بگھی نکلوائی اور چھوٹی حویلی پہنچ گئے ———

دستور اور قاعدے کے مطابق، پہلی صبح خوشی خوشی ساس دُلہن کے کمرے میں پہنچیں کہ گل بوٹوں سے بھری چادر سمدھن کو مٹھائی کے ساتھ بھجوائیں کہ اُن کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

چادر پر گل بُوٹے تو کیا کھلتے، خود دلہن کے چہرے کا پھول کھی جوں کا توں، افشاں اور مسی سے سجا سجایا، اَن چھوا پڑا ہوا تھا۔

"اَئی اُجاڑ ——— یہ کیسی سہاگ رات منایا جی اپنے ———" وہ بیٹے کو دل ہی دل میں پیار سے بُرا بُرا بولنے لگیں ——— پھر خود ہی ہنسیں ——— "اَئی اُجاڑ ماری میری عقل پو بڑھاپے سے پتھر پڑ گئیں ——— دولن پاکی کا نہانا نئیں نہائی ہوئیں گی ——— چلو آج نئیں تو دو چار دن کے بعد . . . . ."

ساس کے جانے کے بعد ستانے والیوں کی پوری فوج اندر گھس پڑی ——— کوئی گالوں پہ نیل کے نشان ڈھونڈھ رہی ہے۔ کوئی بستر پہ بگوں کے جوڑے کے

گرے ہوئے نگ تلاش کر رہی ہے۔ کوئی سونا بائی چوڑیوں کے ٹکڑے ڈھونڈھ رہی ہے۔ کوئی مرجھائے ہوئے پھولوں کو ہنس ہنس کر دیکھ رہی ہے۔

سنجلی دُلہن چپ چاپ کھڑی تھیں۔

صابرہ ہونق بنی ایک ایک کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔

دبی دبی سرگوشیوں اور دوپٹوں میں مُونہہ چھپا چھپا کر ابھر آنے والی ہنسیوں سے پرے سنجلی دُلہن بولیں: "تم نا یہاں کچھ بھی نہیں ملنے والا...." وہ کمرے میں موجود لڑکیوں اور عورتوں سے مخاطب تھیں: "نا کالاں پونیل کے داغاں —— نہ چُوڑیوں کے ٹکڑے، نہ دھینگا مستی میں چُوڑیوں کے گرے ہوئے نگاں —— نہ پھُولاں، نہ بکھرے ہوئے پتیاں —— مرد لوگاں کو کیا کمتی ——" وہ ہنسیں "ہور پھر پیسے والے مرداں کو —— ؟ جدھر آنکھاں اُٹھائے اُدھر عورتاں ملتے۔ پھر بازاری عورتاں کے نخرے، ہور چھنال گھنگھوٹے بنے تے کاں سے لاتے —— ؟ بس خوب کھاؤ —— اچھے سے اچھا پہنو ہوڑو —— سُتنے چاندی میں پیلے اُجلے رہو —— ہور یہ بھول جاؤ کی ...." اُن کی دھیمی دھیمی آواز ایک روتی ہوئی چیخ میں بدل گئی ... "ہور یہ بھول جاؤ کی جسم کی بھی ایک بھوک ہوتی ... ..."

نہانے کی ضرورت نہ ہونے پر بھی دُولہن کے غسل کے ہنگامے زنانے میں مچ گئے۔ ڈیوڑھی میں نل نہیں تھے۔ احاطے میں باوڑی (کنواں) تھی۔ بھُوئی کندھوں پر کاوڑ لٹکا کر پانی لا کر بھرتے تھے۔

"اگے دُولن کے نہانے کو باوڑی سے پانی لانے کو بولو گے شمشاد بھوئی کو" مغلانی بی سالے میں چلاتی پھر رہی تھیں۔

"شمشو ابی اپنی مردانے میں پانی بھر کو سو گیا ــــ دوسرے بھوئی کو بولوں؟" کوئی باہر سے پکارا۔

"اَئی وہ اُجاڑ بڈگا خدیر کیا بھریں گا جی ــــ یہاں تو سارے بیبیاں کی اج سہاگ رات منی ہے ــــ بھوت پانی ہونا ــــ" کوئی تیز طرّار خواص بولی ــــ

سارے میں ہنسی مچ گئی۔

پھر شمشو دونوں مضبوط کندھوں پر دو بڑی بڑی مشکیں اُٹھائے آیا۔ سانولے چہرے پر وزن اُٹھانے کی مشقت سے خون چھلکارے مار رہا تھا۔ کچھ پردہ کرتے اندر بھاگیں "اَئی اُجاڑ مرد مانے موہنہ اُٹھا کو اندر چلے آرئیں۔ کوئی بولتا بھی نئیں کی گوشہ کرلیو ــــ"

کچھ جان بوجھ کر کھٹی کھٹی کرتی وہیں کھڑی رہیں۔

صابرہ اپنے بلبے پوڑے سجے سجائے چھپر کھٹ سے یہ منظر دیکھا کی۔

پہلے جمعہ کو پہلی جمعگی ہوئی۔ نئے سرے صابرہ کو دولہن بنایا گیا۔ وہ پھر بھی کنواری ہی رہی۔

دوسرے جمعہ کو حویلی کے دستور کے مطابق پھر جمعگی کی رسم ہوئی۔ صابرہ پھر دلہن بنائی گئی۔ وہ پھر بھی کنواری ہی رہی۔

پانچوں جمعے یوں ہی نکل گئے۔

دولت نواب اُسے چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے دیکھتے ــــ صرف دیکھتے ــــ بہت ہوا تو کبھی اس کی پیٹھ پر نظر جا پڑتی تو ہنس کر بولتے: "کتے لمبے بالاں ہیں

باپ ——"

کبھی خوب بڑا جوڑا بندھا دیکھتے تو بولتے : "کیا کپّہ کا کپّہ (ڈھیر کا ڈھیر) ہے حضّت —— تم کو تو تکئے کی بھی ضرورت نئیں ——"

ایک دن صابرہ بڑے تیکھے انداز میں بول اُٹھی : "تکئے کی تو واقعی ضرورت نئیں، پن ہور کسی چیز کی تو ضرورت پڑتی ہوئیں گی —— !"

جس کا پیٹ بھرا ہو اس کو دوسرے کی بھوک کا پتہ نہیں چل سکتا۔ نواب صاحب نے بغیر جانے بوجھے کہا "ڈیوڑھی میں کیا نئیں ہے بول کے جناب —— آپ امنّی حضور سے بول دیا کرو۔"

صابرہ سر پیچھے کو ڈال کر اس بُری طرح ہنسی کہ اس کے سارے بال جوڑے سے کھُل کر فرش پر بکھر گئے۔

"میری شادی امنّی سے ہوئی کیا —— ؟ ہور وہ میرے کو . . . ." اِک دم وہ بات پی گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ایک بات آپ میرے کو بتائیں گے —— ؟"

"جی ہو —— آپ پوچھو تو۔"

"اللہ میاں ایک مرد کو چار شادیاں کی اجازت دیا نا —— ؟"

"جی ہو —— پھر —— ؟" وہ حیرت سے بولے۔

"میں تو ابھی دہم جماعت میں پڑھ ارہی تھی کی اُٹھا کو میری شادی کر دیئے ماں باپ —— اِتا علم میرے کو نئیں آتا، اس واسطے آپ سے پوچھ رئی —— ایک مرد کسی دن ایک عورت کے پاس، کسی رات دوسری عورت کے پاس —— یا بھوت بھی بھوت ہوا تو چلو سمجھو اُنے دن باندھ دیا کی جمعہ کو پہلی شنبہ کو دوسری، یک شنبہ کو تیسری . . . . اب میں پوچھتیوں کی فرض کرو وہ جمعہ والی بہت کستاڑی ہے، اُنے بولتی میرے کو خالی ایک دن نکو۔ روز روز میرے پاس آؤ . . . . . ."

"اَگے اَگے اَگے ..." دولت نواب غصّہ سے بولے: "یہ اپنے شریف گھرانے کے ہوکے تم کیسے کیسے باتاں کرلے رئیں بی بی ——"

"میں کوئی کپڑے اُترے دے باتاں تو نئیں کررئی۔ آپ سے ایک سیدھی سادی بات پوچھ رئی ... ..."

وہ ہانپ کر بولے "ہم کو جتنا معلوم ہے آپ کو بتاتے —— دیکھو عورتاں ہیں نا۔ ہمارا مطلب ہے بیویاں —— تو امّی حضور ہورابّا حضور ہور مولوی صاحب، سوب یہ بتائے کی بیویاں مرد کی زمین ہوتے۔ کھیتی ہوتے —— ہور یہ کی مرد جب چاہا اپنی کسی بھی کھیتی میں جالے سکتا ... ..."

وہ بات کاٹ کر چلّائی "وہ تو میں بھی سمجھی جی، کی بیوی مرد کی کھیتی ہوتی۔ پر کھیتی کو پڑپٹ ڈال کو رکھے، سو وہ دھائی نئیں دیتی کیا ——؟؟

اس کے گالوں کے گلاب دہک رہے تھے —— سُرخ سُرخ ہونٹوں کے کنارے پھڑک رہے تھے، آنکھیں شعلوں کی مانند ہورہی تھیں۔ سیاہ لمبے لمبے بال آگے پیچھے جھول رہے تھے —— ڈھیلے کُرتے میں مسلسل سرکشی ہورہی تھی اور پنڈلیوں پر کسے تنگ پاجامے نے یہ راز کھول دیا تھا کہ وہ قابو سے باہر ہے۔

چار نکاحی بیویوں کے باوجود بھی دولت یار جنگ پارسا نہیں تھے۔ یہاں وہاں موہنہ مارتے رہتے تھے۔ اصل میں کیا ہے کہ کسی کے پاس بہت سارے کپڑوں کے جوڑے ہوں نا، تو پہلے دن جو جوڑا پہنا تھا اُس کی باری بہت دنوں بعد آتی ہے یا آتی ہی نہیں۔ جو سامنے آیا اُسے ہی چڑھالیا۔

وہ صابرہ کی طرف لپکے —— وہ پیچھے ہٹ کر غصّے سے بولی: "بڑے آئے ستر جوروؤں کے مَردوتے —— میرے کو ہاتھ نکّو لگاؤ ——"

"کیوں نکّو لگانا ——؟ ہم مَرد نئیں کیا تمہارے ——؟"

"میری نمازاں خضا ہو رئیں آج کل ـــــ"

انھوں نے سر پر ہاتھ مارا" اتّے سارے باتاں تم ناکاں سے معلوم ہو گئے جی ـــــ ابّی ابّی تو مدرسے سے اُٹھاتے اماں باوا ـــــ"

وہ انگارہ بن کر بولی "گلّی میں کبھی کُتّا کُتّی بھی نئیں دیکھی ہوئیں گی کیا میں ـ؟"

سنجلی دُولہن دوسرے دن خوشی سے سرشار، شاباشی دینے کے انداز میں بولیں "تمہارے باتاں سو سب سُنی ہیں ـــــ بہوت ہی بہوت اچّھا کھرا بولے تمے ـــــ غُصّے میں تمہاری آواز بہوت اونچی ہو گئی تھی۔ میرے کو بھی کبھی ہاتھ نہیں لگاتے ماں ـــــ بس اُنوں کو باہر کے حرام زادیاں اچ ہونا ـــــ تمہارے ویسا جھگڑے تو میں کبھی نئیں کری۔ ایک دو بار دبی زبان سے خالی ایسا بولی کہ میرے کو اکیلے کمرے میں ڈر ہوتا، تو کیا بولے معلوم ـــــ؟" میں سمجھ لیا ـــــ عورت مرد کی کھیتی ہوتی۔ جب چاہے آئے سکتا ـــــ جب میرا جی چاہیں گا آجاؤں گا ـــــ"

صابرہ دانت پیس کر بولی "ہور جب میرا جی چاہیں گا تو ـــــ؟؟" پھر لوہار کی دھونکنی بن کر کہنے لگی "ہو باجی، فرض کرو ایک مرد ہے۔ اس کے چار جوان بویاں ہئیں۔ چاروں بولتیئں کی آج میرے پاس رہو، آج میرے پاس رہو ـــــ چلو جانے دیو چاروں کو۔ خالی اُن میں کی ایک اچ ایسی ہے کی بولتی تم میرے کو روز ہونا ـــــ ہور وہ اس کے ارماناں روز روز پورے نئیں کر سکتا ـــــ ہور طلاخ بھی نئیں دیتا تو اُنے کیا کرنا؟؟ وہ ترسی وی عورت کیا کرنا ـــــ؟"

سنجلی دُلہن اپنے گالوں پر دھیرے دھیرے تھپڑ مارنے لگیں: "توبہ ـــــ توبہ ـــــ تم کائے کو ایسا مکروہ لفظ موںہہ سے نکالتے ماں ـــــ جانے دیو گناہ ہوئیں گا۔

اللہ معاف کریں گا — غصّہ کرنا بھی گناہ ہے بول کے —"

دولت نواب اُس ایک دن کے وقتی اُبال کے بعد چھوٹی دُلہن کو پھر بھول بیٹھے۔

شمشو بازو کی مچھلیاں نکالے وزنی وزنی مشکیں لٹکائے آیا تو مغلانی بولیں: "اَگے بھوئی یہ دیکھ کے آنگن کی جھاڑی کتّی سوکھ گئی۔ موا مالی کتّے دن سے پلٹا اچ نئیں — ایک کا ڈرا ادھر بھی ڈال دے ماں۔ پھولاں کھِل جائیں گے بول کو —"

"ہو امّی —" اُس نے پھُولی پھُولی سانسوں کے درمیان کہا "ابّی اچ لے لیو — حمام میں بعد میں دوسرے پھیرے میں لا کو ڈالتاوں —"

تھانولے میں کھڑی سوکھی جھاڑی سَر سَر کر کے شن شن کی آوازیں نکالتی، سارا پانی ٹس ٹس پی گئی۔

"اَئی دیکھا ماں کتّی پیاسی تھی —" مغلانی بی شمشو کی بلائیں لے کر بولیں: "بڑا سیدھا ہے ماں تو — ہر ایک کا دِل رکھ لیتا — اللہ تیکو اچھّا رکھو —"

دوسری کا ڈر لے کر شمشو حمام میں پہنچا تو چھوٹی دُلہن نے نہانے کے لئے کپڑے اُتار کر کونے میں پھینک دیئے تھے اور آنگن کی جھاڑی کی طرح پیاسی کھڑی ہوئی تھیں ...

دوسرا مہینہ لگتے ہی اُبکائیوں اور اُلٹیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ساس تو
واری صدقے جانے لگیں۔ دولت نواب کو پتہ ہی نہیں۔
اتنی بڑی ڈیوڑھی، اتنا سارا عملہ۔ پھر ماں سے ایسا کام بھی کیا پڑتا تھا کہ بار بار
ملاقات کرتے ــــــ بہت دِنوں بعد امّی حضور نے بیٹے کو دیکھا تو چٹ چٹ
بلائیں توڑیں "اللہ میری سُن لیا ماں ــــــ مولا بڑا مہربان ہے ماں ... ..."
وہ کچھ بھی نہ سمجھے۔
لیکن اُس دِن جب وہ چھوٹی دُلہن کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ عو۔
جو کر کے اُبکائیاں لے رہی تھیں۔ ان پر چودہ چھوڑ چودہ کے پورے پہاڑے جتنے
طبق روشن ہو گئے۔
"یعنی کی ... ــــــ یعنی کی ... ..." وہ الفاظ ڈھونڈھنے کی کوشش میں
ہکلانے لگے "یعنی کی آپ کو بچہ ہو رہا شاید ... ..."
صابرہ نے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ موم کے ہوتے تو وہیں قطرہ قطرہ
پگھل جاتے۔
"مگر ہم تو غالباً آپ کو ابھی تک اُنگلی بھی نہیں لگائے بول کے ــــ"
"صحیح بولے آپ، آپ کی اُنگلی بھی نئیں لگائے ــــــ مگر آپ کو
یاد ہوئیں گا نا آپ بولے تھے عورت مرد کی کھیتی ہوتی۔ زمین ہوتی ــــــ
کئیں کب تک پڑ پت زمین ہور بے کار کھیتی کے ویسا پڑی رہتی ــــــ آپچ
بولے نا عورت تو کھیتی ہوتی! بس میں بھی ہَل چلوا لی ــــــ" اُس نے طنز میں
ڈوبی کٹیلی آواز میں کہا اور پھر معصومیت سے پوچھا:
"میں غلط کری کیا ــــــ؟"

(غیر مطبوعہ

تیاپانچا

دُلہن کی یہ درگت دیکھتے ہی خالہ بی کا اپنا چہرہ شرم سے تپ کر سُرخ ہو گیا۔

وہ تو اچھا ہوا کہ شادی گھر کے سب ہی لوگ تھکے ماندے ابھی تک سال سال سوتے پڑے تھے۔ خالہ بی سدا سے جلد اُٹھ جانے کی عادی تھیں۔ نماز پڑھ کر فارغ ہوئیں تو سوچا، چلو دُلہن دُولہا کی خیر خیریت ہی پُوچھ لیں۔

اکثر دُولہا شادی کی رات یا تو سوتے ہی نہیں، یا سوتے بھی ہیں تو مَرد ہونے کے باوجود اللہ جانے کا ہے کی شرم یا ڈرا نہیں ہوتا ہے کہ صُبح ہی صُبح اُٹھ کر حجلۂ عروسی میں کھٹر پٹر شروع کر دیتے ہیں۔ یا تو شیو کر رہے ہیں، یا مُلحقہ غُسل خانے میں پھیرے مار رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ دُلہن کو چھیڑتے بھی جا رہے ہیں، معافیاں مانگ رہے ہیں۔ چائے ناشتے کو پُوچھ رہے ہیں۔ کچھ اپنی رات بھر کی دی گئی تکلیفوں کا میل مٹانا بھی مقصود ہوتا ہے اور کچھ اگلی رات کے لئے پٹانا بھی مدِ نظر ہوتا ہے۔

اسی کھٹر پٹر کو سُن کر برابر کے کمرے میں خالہ بی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دُولہا میاں

جاگ اُٹھے ہیں۔ اُنھوں نے دانستہ کھنکار کھنکار کر وضو کیا، نماز پڑھی۔ اپنے کمرے کا دروازہ خواہ مخواہ زور زور سے کھولا، بند کیا، تاکہ دُولہا میاں کو کان ہو جائیں۔ اُدھر دُولہا میاں سراپا آنکھ بنے ہوئے تھے، لیکن خالہ بی کے "مظالم" سے تنگ آ کر اُنھوں نے بھی اپنا دروازہ کھول دیا اور رات بھر کی ترنگ میں مست، چمن کی ٹھنڈی ہوا کھانے پچھواڑے نکل گئے۔ سوچا، خواہ مخواہ خالہ بی کو دیکھوں گا تو شرم آئے گی۔"

خالہ بی مسکراتی ہوئی سجے سجائے چھپر کھٹ، (جس کی اب بُری گت بن گئی تھی) کی پٹی سے ذرا ٹک کر بیٹھیں اور سُرخ مہرو کا کونا اٹھا کر ثمینہ سے کچھ سوال کرنے ہی والی تھیں کہ بس!

"دوتی بی بی!"

وہ اتنا ہی بول پائیں۔ دُلہن کی دُرگت دیکھتے ہی خالہ بی کا اپنا چہرہ شرم سے تپ کر سُرخ ہو گیا۔

دُلہن کا بس چلتا تو مارے شرم کے چھپر کھٹ میں گڑ جاتی۔ وہاں سے پھسل کر زمین میں سما جاتی۔ مگر اس وقت بس اُس نے سُرخ زرتار مہرو کو کس کر اپنی چاروں طرف لپیٹ لیا اور گھٹنوں میں مونہہ دے لیا۔

"اے بی میں پوچھوں ہوں، تمہارے کپڑے کیا ہوئے؟"

سُرخ چادر کے اندر دُلہن ننگی جھاڑی بیٹھی تھی۔

"اچھا بھلا اچھا خاصا اورنگ آبادی ہمرو کا کھڑا پاجامہ، جامہ وار کا زرتار کرتا اور گوٹے ٹھپے سے لس لس کرتا کھڑا سات داری دوپٹہ عقد خوانی کے جوڑے میں چڑھاوا آیا تھا، اور یہاں تو ایک ہی رات میں فقیری ٹمکار گئی تھی۔

"وہ — وہ خالہ بی — اُوں ... ..."

"کیا اُوں اُوں کر رہی ہو بیٹی؟" خالہ بی مسکرائیں — وہ تو اچھا ہوا

کہ سب سے پہلے میں ہی پہنچی ـــــ لیکن بی بی کم سے کم تم ... ... "اب وہ کیا کہتیں؟

"پلیز خالہ بی، آپ ہی ایک جوڑا نکال دیو نا ـــــ" وہ دھیرے سے بولی "سوٹ کیس میںچے اچ تھا ... ..." وہ خود بھی مسکرا رہی تھی۔

"لیکن وہ رات والا نکاح خوانی کا جوڑا کیا ہوا، جو سوٹ کیس سے نیا جوڑا نکال دوں؟ غضب خدا کا، ابھی نہائی بھی نہیں ہو۔ کیا دوسرا جوڑا بھی ناپاک کرو گی ـــــ؟"

ثمینہ نے موبنہ سے کچھ کہے بغیر، ذرا سا مڑ کر، ہاتھ تکیوں کی طرف بڑھایا اور ایک ڈھیر سا کھینچ کر خالہ بی کے آگے کر دیا۔

حیرت سے خالہ بی نے وہ ڈھیر اپنی طرف کھینچا اور اب اٹھاتی ہیں تو ایک پاجامے کے دو پاجامے، ایک کرتے کے دو کرتے۔ البتہ دوپٹہ ثابت تھا، بس جگہ جگہ سے مسک گیا تھا۔

"ووئی یہ تین کپڑوں کے پانچ کپڑے! اے بی، یہ تیا پانچا کیسا؟"

ثمینہ شرم سے سرخ پڑ گئی۔ اس کے روشن روشن چہرے پر حیا کا سنہرا رنگ مل کر اس کی گذری رات کی واردات سنانے پر تل گیا ـــــ

"خالہ بی، میں اُنوں کو روکتی تھی، اُنوں کھینچا تانی کرتے تھے ـــــ پہلے ایک کرتے کے دو کرتے ہوتے، پھر خالہ بی اُنوں یہی اِچ دھینگا ناپاجامے کے ساتھ کرے ... ..."

مگر ثمینہ تو خاموش تھی۔ خود خالہ بی کی سوچ نے لفظوں کا روپ پہن لیا تھا۔

"غضب خدا کا لڑکی! ایسی سہاگ رات تو میرے اچھوں نے سنی نہ دیکھی۔

تو یہ بڑا تولیہ لپیٹ لو اور چلو غسل خانے میں۔ لڑکیاں بالیاں اُٹھ کر آگئیں تو کیا سوچیں گی؟" اُنہیں ہنسی بھی آرہی تھی، شرم بھی۔

"توبہ توبہ!" وہ دِل ہی دل میں توبہ توبہ کرتی جارہی تھیں۔ "ایسی بھی کیا دیوانگی موئی! تمہارے دُولہا میاں بھی خوب ہیں بی بی . . . ."

ایسے ہی دیوانے تھے رضا میاں ——

نواب سطوت یار جنگ نے خود تو یوں ہی واجبی سی تعلیم پائی تھی، لیکن بیوی کر کے لائے تھے دہلی کی۔ شاید ماں کی طرف کے اثرات اولاد میں آئے ہوں گے کہ سب ہی نے خُوب تعلیم حاصل کی —— رضا میاں علی گڑھ سے بی اے کر کے لوٹے تو حیدرآبادی چلن اُنہیں ایک آنکھ نہ بھایا —— نہ وہاں کی شیروانی، نہ وہاں کی پریشانی —— بریانی البتہ وہاں کی خُوب پسند کرتے تھے اور ایک عزیز کی شادی میں جس لڑکی نے بریانی پکائی تھی، اُسے بھی پسند کر بیٹھے۔ سُنا تھا دو پڑھی اور پر وہ بھی "ہندوستانی" تھے —— خود علی گڑھ میں رہ اور پڑھ آئے تھے، اس لئے ان کی اپنی زبان، بول چال اور لہجے سے تو دکنی رنگ ہٹ چکا تھا۔ لیکن ناک چڑھ کر حیدرآبادی دکنی بولی بولتی ہوئی، کانوینٹ کی پڑھی ثمینہ اُنہیں حد درجہ پسند آئی۔

جب اُنہیں پتہ چلا کہ اتنی بڑی برات کی بریانی اس دُبلی پتلی حسین لڑکی نے پکائی ہے تو وہ تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

"اللہ —— اِتّے جھوٹے تعریفاں نکّو کرو۔"

اس وقت اس نے شادی کے موقعے کی مناسبت سے خُوب چمکتے دمکتے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لمبی سی گوری گردن میں حیدرآبادی زمرد کا جڑاؤ پٹہ۔ اس کے سیٹ کے کرن پھُول جھُمکے۔ ہرے نگوں کا چُوڑیوں کا جوڑا۔ ہرا ہرا لباس۔ ناک

میں ہرا زمرد جیسی رنگ۔ سادی کی گھما گھمی سے دمکتا ہوا چہرہ۔ چہرے پر جڑی ہوئی دو ہیروں جیسی آنکھیں۔ آنکھوں میں قتل عام کرتا ہوا کاجل —— کاجل اور کچھ شرم کے بوجھ سے جھکی جھکی پلکیں —— اور پلکوں کا رہ رہ کے جھپکنا اور گورے گورے بیج صبح اور سرخی لئے ہوئے گالوں پر بار بار جھک جانا۔

"میں اُلّو کا پٹھا علی گڑھ کیوں جا مرا تھا!" انہوں نے اپنے آپ کو بے حد بشاشت سے گالی دی ——

"اے سبز پری —— اے زمرد پری —— بہرحال وہ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ اتنی جرأت اور بے باکی ان میں تھی کہ دل کا حال، گھائل کرنے والی کو سُنا سکیں۔

وہ سراسیمہ ہو کر مڑی ——

"آپ میرے سے کچھ بولے؟"

"ہاں ہاں، آپ ہی سے مخاطب ہوں، اے زمرد پری —— کہ اس وقت جو آپ کو ہر طرف ہرا ہرا نظر آرہا ہے تو عنقریب لال لال نظر آئے گا۔۔۔" وہ دل تھام کر بولے۔

"اللہ آپ کیسے باتاں کر رئے؟ میں کچھ نئیں سمجھی!" وہ گھبرا کر بولی۔

"میں سمجھاتا ہوں —— ابھی سمجھاتا ہوں۔ دیکھئے، آپ نے جو اپنی قاتل آنکھوں کے تیر چلا چلا کر مجھے زخمی —— بلکہ قتل کر دیا ہے نا تو ابھی میرا خونِ ناحق یہاں پھیلنے والا ہے اور سارے میں سُرخیاں ہی سُرخیاں ہوں گی۔"

"بکو اللہ —— پلیز!" وہ منمنائی۔

"دیکھئے دیکھئے، اب آپ یہ اپنے سُرخ سُرخ موٹے موٹے بھرے بھرے سیکسی ہونٹوں کو سکوڑ کر پلیز ولیز کہیں گی نا تو ابھی ابھی —— خدا کی قسم اسی شامیانے

تا ایک کی بجائے دو دو دولہا بیٹھے نظر آئیں گے۔ پھر ہائے توبہ ہائے تلا کرتی پھریے گا ——— جی ہاں ....“

وہ گھبرا کر اپنی امّی کے پاس بھاگ گئی۔

لیکن بہر حال اسے ننھا میاں کی آغوش میں پناہ لینی ہی پڑی۔

نہ تو انہوں نے نوابوں کے سے اطوار اپنائے تھے، نہ اپنے نام کے ساتھ نواب لگانا ہی گوارہ کیا تھا ——— بی اے پاس کر کے آتے تو سرکار میں عرضی گزاری اور بلدہ ہی میں نائب تحصیل دار لگ گئے۔

لڑکی والوں کو پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جگمگاتے ہوئے سورج جیسے خاندان کے سپوت تھے۔ پڑھے لکھے۔ کماؤ پوت۔ اور پھر یہ کہ باپ کو اللہ اچھا رکھے، مرتے تو لاکھوں کی جائداد کے تنہا وارث! اور پھر جس چاہت سے انہوں نے پیام بھجوایا تھا اور خود جواب کی جلدی میں جو سسرال کے پھیرے کئے تھے تو حیدر آباد کی گلی اور پاؤں کی تلی ایک کر دی تھی۔ سسرال کی دہلیز اور چوکھٹ اچھا ہوا سنگِ مرمر کی تھیں، ورنہ گھِس گھِسا کے صاف ہو گئی ہوتیں۔

ایسی چاہت سے، ایسے چاؤ کی دُلہن ملتی تو جو حشر نہ کرتے بے چاری کا، کم تھا ———

سارے خاندان میں مدّتوں اسی "تیا پانچا" کا چرچا رہا۔ ثمینہ تو چور بن گئی جس کبھی محفل میں جاتی، جہاں بھی لڑکیوں کی فوج ہوتی، وہ شروع ہو جاتیں:

"اللہ تیا ناثمو، کیا ہوا تھا دولہا کے ہ؟"

"کتے اُنوں تیرے اتّے بھاری جوڑے کی چندی چندی الگ کر کو رکھ دیتے تھے؟"

"اللہ، تو کیسی ثابت رہ گئی بھی گے؟"

کوئی سرگوشی میں کہتی "ابا کاں کی ثابت ہے کہیں نہ کہیں سے تو ٹوٹی پھوٹی آج ہو ئیں گی۔

پھر معنیٰ خیز ہنسیوں کے فوارے۔

"کتے نیلاں پڑے تھے گے؟"

وہ کونے کونے موہنہ چھپاتی، لیکن سہیلیاں اسے چھیڑے جاتیں۔"

ایسے میں رضا میاں بھی آجاتے تو اور مذاق میں مزید گندگی، مزید جان پڑ جاتی۔

وہ بھی کہاں چوکتے ـــــ دل پر ہاتھ رکھ کر کہتے: "غالب کو غم سمیٹنے کے لئے بہت سے دلوں کی حاجت تھی۔ ہمیں بھی بھائی ہزاروں دل اور ہزاروں آنکھیں چاہئیں۔ ان حور صاحبہ کی محبت سمونے کے لئے، انہیں دیکھنے کے لئے، انہیں چاہنے کے لئے..... ..."

لڑکیوں کے چہروں کا رنگ بدلنے لگتا ـــــ ثمینہ کے لئے ایک جلن سی ان کے دلوں میں آجاتی ـــــ واقعی اتنی چاہت جسے ملے، اس کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانا؟

پھر اسی چاہت میں خدا نے ایک اور اضافہ کیا ـــــ ایک ہی سال کے اندر ثمینہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی۔

"بھئی کیا بات ہے آپ کی!" رضا میاں مکاری سے اُسے دیکھتے خاص طور سے اس وقت جب وہ ننھے کو دودھ پلا رہی ہوتی۔

"ٹھاٹ ہیں سالے کے!" وہ بچے کو دیکھتے ہوئے بدمعاشی سے مسکراتے "اب ہمارے ایسے نصیب کہاں؟"

"اللہ!" ثمینہ شرم سے تپ جاتی۔ کچھ تو خیال کرو آپ، کوئی سن لیں گا تو کتنی بری بات ہے۔"

"ارے بھائی، یہ بہت پرانا مکالمہ ہوگیا کہ 'کوئی سن لے گا تو ——' سن لے گا تو وہ بھی جوان ہو جائے گا —— اگر بوڑھا ہے تو۔ اور اگر جوان ہے تو ماں کے پاس دوڑے گا کہ فوراً میری بھی شادی کرا دو۔ سمجھیں؟"

رضا میاں نائب تحصیل دار سے، تحصیل دار بنے —— ایک بیٹے سے دو بیٹوں کے باپ بنے —— لیکن ذرا جو ثمینہ سے محبت، چاہت اور عشق میں کمی آئی ہو۔

نوکری سے ہٹ کر جائداد کا کیا کم پیسہ تھا۔ گھر میں موٹر بھی رکھی۔ شام کو آفس سے آتے تو ثمینہ بھی ان کے عشق میں دیوانی، ہارن کی آواز سنتے ہی، بچوں کو آیاؤں کے پاس چھوڑ، بنگلے کی سیڑھیوں کے اوپر آ کھڑی ہوتی۔ دس سیڑھیوں نیچے پورٹیکو تھا —— کار میں سے اترتے ہی رضا میاں کی نگاہ اوپر کھڑی ثمینہ پر جا ٹکتی۔ پیاسی آنکھوں سے اسے پیتے ہوئے، بے ڈھنگا سا اشارہ کرتے۔

"خدا کی قسم اس قدر پیاری لگ رہی ہو —— چلو فوراً —— ایک دم نیچے آجاؤ ——"

"اللہ، کتنے گندے گندے باتاں کرتے آپ۔" وہ شرما جاتی ——

وہ ہنستے —— ارے واہ گندا تمہارا اپنا دماغ ہے۔ میں سچا، سیدھا، شریف آدمی —— کس قدر سادہ سا جملہ میں نے کہا کہ 'بے حد پیاری لگ رہی ہو، ایک دم نیچے آجاؤ ——' اب تمہارے دماغ میں گندگی بھری ہے تو میں کیا کروں؟ میرا مطلب تو یہ تھا کہ دس سیڑھیاں نیچے آجاؤ۔ وہ زور زور سے خود ہی ہنسنے لگتے ——

"آپ تو جیسے جیسے بوڑھے ہورئے، ویسے ویسے اور بھی بے شرم ہورئے ——"

وہ اوپر آ کر اس کے گلے میں ایک ہاتھ ڈال کر اسے قریب کھینچ لیتے۔

"ارے بوڑھے ہوں گے تب ہوں گے، لیکن بڑھاپے سے پہلے ایک بیٹی کا باپ بنا دو۔ مگر بالکل اپنے جیسی۔ یہی بیضوی چہرہ، یہی گلابی گلابی رنگت۔ ایسی ہی بڑی بڑی آنکھیں۔ ایسی ہی ہنسی۔ ایسے ہی گھنے گھنے بال —— بیٹی ہوگی تو شاید خود کو ذرا ذمہ دار اور بوڑھا سمجھیں۔"

لیکن تیسری بار بھی ثمینہ کے بیٹا ہی ہوا اور رضا میاں کی خود کو ذمہ دار اور بوڑھا سمجھنے کی حسرت، حسرت ہی رہی۔ وہ سدا جوان، سدا بہار جوان، اور ثمینہ سدا سہاگن بنی رہی۔ اور وقت کیسے دھیرے دھیرے کھلتے کھلتے مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل پڑا، اس کا احساس ہی نہ ہوا۔

نہ رضا میاں کی چاہت میں کبھی کمی آئی، نہ انہیں ثمینہ کبھی بوڑھی ہی لگی —— بوڑھی وہ لگتی بھی کیسے؟ تین لڑکوں کی پیدائش نے اُس کے جسم پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ڈالا تھا —— ویسی ہی تنی تنی جوانی پہرا دیتی رہی —— بالوں نے البتہ ذرا سی بے وفائی کی تو انہوں نے بالوں کو حنا رنگ کر لیا، جو اس کی سرخ و سفید رنگت پر بڑے ہی خوب صورت لگتے —— پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی غضب کا تھا۔ کانوینٹ کی پڑھی ہوئی لڑکی —— عورت بن کر بھی خود کو لڑکی بنائے رکھنے کا فن جانتی تھی۔ اب میاں کے اتنے بڑے عہدے پر پہنچ جانے کے بعد کہ محفلیں اور پارٹیاں زندگی کا لازمی جزو بن جاتی ہیں، وہ اس طرح سج دھج کر جاتی کہ کئی بار تو نئے مہمانوں نے رضا کو اور اسے باپ بیٹی سمجھا —— لیکن رضا خود کو بوڑھا سمجھنے کو تیار تھے نہ ثمینہ کو۔

ایک چھٹی کے دن ——

رضا میاں شام پانچ بجے اپنے ہی بنگلے سے ملحق چمن میں چہل قدمی کرنے کے لئے جانے لگے تو اپنے سلیم شاہی سفید جوتے انہیں نظر نہیں آئے —— اِدھر اُدھر

ڈھونڈھ ہی رہے تھے کہ امتیاز وہی جوتے پہنے نظر آیا۔ اب جو انہوں نے حیرت سے امتیاز کے پیروں کی طرف سے اس کے سر کی طرف نگاہوں کا سفر شروع کیا تو پہلی بار احساس ہوا کہ نہیں بھائی، ہم تو بہت دُور نکل گئے۔

مرد کی ذات بھی کیا ذات ہوتی ہے! واہ! بیٹے کی جوانی اور قد و قامت دیکھا تو اپنے بڑھاپے کا تو قطعی خیال نہیں آیا۔ فوراً خیال لپکا ثمینہ کی طرف۔ "ارے! ثمینہ اتنے بڑے بڑے بیٹوں کی ماں بن گئی کہ جن کے پیروں میں میرے جوتے فٹ آجاتے ہیں!"

ثمینہ کو پارٹیوں میں بچوں کو لے جانے سے سخت چڑ تھی، حالانکہ وہ ایک طرح اس کی جوانی کے چلتے پھرتے اشتہار تھے، کیوں کہ گھریلو محفلوں میں، یا اُن کے گھر آنے والے بڑے بڑے عہدہ داروں سے بھی تینوں لڑکوں کا تعارف کرایا جاتا تو ہر شخص کسی بناوٹ کے بغیر حیرت سے کہتا: "اُوں آپ کے بیٹے؟ نہیں نہیں ـــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے بول کے ـــــ آپ کے بھائی ہوں گے۔"

ثمینہ دہری خوشی پاتی ـــــ عورت، جو سدا جوان نظر آنا چاہتی ہے۔ اور اگر لگتی بھی ہے، تو چاہے وہ کتنی ہی بڑی ہو، یہ اس کے لئے ٹانک ہوتی ـــــ اور دوسری اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھنے کی خوشی۔ لیکن رضا میاں اس وقت صرف مُسکرا کر رہ جاتے۔ ان کا جسم کچھ بھاری ہو چلا تھا۔ کنپٹیوں پر کچھ چھلّے سفید کالے ہونے لگے تھے۔ سب انہیں تینوں بیٹوں کا باپ ہی کہتے ـــــ

کچھ دن سے ثمینہ کو ان کے والہانہ عشق میں ایک کمی سی محسوس ہونے لگی تھی، جیسے وہ وقت، عمر اور مصلحت کا تقاضا سمجھتی تھی کہ ایک تو اصل عشق و محبت کا دور واقعی بیت ہی گیا تھا ـــــ دوسرے عمر کی چڑھتی ندی بھی اب اُتار پر تھی ـــــ پھر تین جوان جوان لڑکوں کے سامنے جوانوں کی سی چہلیں بڑھاپے میں زیب بھی تو نہیں دیتیں۔

لیکن ثمینہ احمق تھی۔ اسکول میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے والی طالبہ ضروری نہیں کہ زندگی اور گھر گرہستی کے امتحان میں بھی اچھے نمبروں سے پاس ہو —— وہ کچھ اور سمجھ رہی تھی، حقیقت کچھ اور تھی۔

رضا میاں کو اچانک ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ ثمینہ تو اب بوڑھی ہو چکی ہے، چاہے کتنی ہی جوان لگے —— کیا وہ دیکھتے نہیں تھے کہ ایک خادمہ اب صرف اس کے بالوں کی نگہداشت پر مامور ہے۔ چہرے پر طرح طرح کے ماسک وہ لگاتی ہے۔ لوشن۔ کریمیں۔ پھر رات کو گھریلو نسخے۔ بالائی۔ پسے ہوئے بادام۔ شہد۔

اِدھر اپنے طور پر خود میں وہ کوئی ایسی کمی نہیں پاتے تھے جو وہ الگ بستر پر سونے کے خواہش مند ہو جاتے۔ پھر جوانی کے دنوں میں وہ ثمینہ سے روز بدمعاشی سے کہتے تھے: "دیکھو، سو نہیں جانا۔ مجھے ٹانک چاہیئے —— ہاں" اور ایک شریری ہنسی ہنس دیتے —— ثمینہ اس 'ٹانک' کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ وہ دِل ہی دِل میں ہنستی —— "آپ کو ٹانک ہونا تو کیا میں بھی وی اِج نئیں چاہتی —— پر اچھا ہے مانگنے کی عادت اللہ مرد کو ڈالا۔ تئیں تو عورت ایسی بے شرمی کے باتاں کرتی دی کتنی بُری لگتی۔"

رضا میاں کو تو اس 'ٹانک' کی اب بھی روزانہ، یا روزانہ نہیں تو کم سے کم ہفتہ میں پانچ بار تو ضرور طلب محسوس ہوتی تھی، جب کہ ثمینہ نے باقاعدہ اپنا بستر ہی الگ لگوا لیا تھا۔ کبھی ہفتہ دس دن میں رضا میاں بڑی چاہت کا جوش لئے اس کے بستر میں رینگ بھی جاتے تو وہ اس قدر کِن مِن کِن مِن کرتی کہ ان کا سارا مُوڈ غارت ہو جاتا۔ پھر دوسرے دِن وہ کام پر بھی نہ جاتے اور بھوت کی طرح گھر میں گھومتے رہتے یا خوب بڑا چہرہ تھتھا کر سَر سے پاؤں تک رضائی اوڑھ کر اپنے غصّہ کا اظہار کئے جاتے۔ یوں ہی رات سے صبح اور صبح سے پھر رات ہو جاتی ——

رضا میاں کی حیثیت کے سارے عہدہ داروں کے بنگلے ایک ہی لوکلیٹی میں تھے۔ سب ہی اپنے اپنے گھروں سے پیسے والے، معزز اور آزاد خیال ـــــ پردے، برقعے، عام حیدرآباد دکن کی خواتین کی طرح اُن عہدہ داروں کی خواتین استعمال نہ کرتیں۔ کھڑے دوپٹے، تنگ پاجاموں کے ساتھ، ہندوستان سے (مدتوں تک اہلِ حیدرآباد، باقی سارے انڈیا کو باقاعدہ الگ سمجھ کر 'ہندوستان' ہی کہتے تھے، وہ اپنے حیدرآباد کو ہندوستان کا حصہ نہ کہتے نہ سمجھتے۔) شلوار، غرارہ اور ساڑی تک فیشن میں چلی آرہی تھی۔

چند دن سے نواب بصالت جنگ کے ہاں رضا صاحب کا جانا آنا ـــــ (جانا زیادہ، ان لوگاں کا آنا کم) کافی بڑھ گیا تھا ـــــ تھے تو شریف خاندانی لیکن کہنے والوں کے مونہہ کو ڈھکن کون لگا سکا ہے کہ نواب صاحب نے اپنی جوان بیٹی کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ خوب دولت والا شوہر پھانس لے۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ کسی تقریب کا اہتمام ہوا، کسی بچے کی سال گرہ، یا اپنی شادی کی ہی سال گرہ ـــــ تو رضا میاں نے نواب بصالت اور ان کی بیٹی زیبا کو بلانا چاہا، لیکن ثمینہ ٹال گئی ـــــ مگر پھر میاں کے اصرار پر بلانا ہی پڑا ـــــ

زیبا بغیر آستینوں کا بلاوز اور بڑی باریک باریک ساڑیاں پہنتی ـــــ ہونٹ سکوڑ سکوڑ کر رضا صاحب، رضا صاحب کر کے انگلش میں کم، اردو میں زیادہ بات کرتی ـــــ

"اُجاڑ ماری کو انگلش آتی اچ نئیں۔ اسی واسطے چپ ایک ایک، دو دو جملے بول کو اٹکنے لگتی۔ ہمارے ویسا پوری پڑھائی بچپن سے کانوینٹ سے تھوڑی ہوئی۔ عورت اپنے ہی مرد کو پرچانے کے لئے اپنی دیکھی بھالی خوبیاں بھی گنوانے لگتی ہے۔

رضا میاں ذرا کڑا مونہہ بنا لیتے۔ دھیرے دھیرے ثمینہ کو اچھی طرح پتہ چل گیا کہ میاں کی نظریں بہک چکی ہیں۔ کیوں کہ اب تو یہ بھی ہونے لگا تھا کہ کئی بار آفس سے گھر پہلے آنے کی بجائے وہیں زیبا کے گھر ہی اُتر پڑتے۔ وہیں چائے ناشتہ ہو جاتا۔ پھر تازہ دم ہو کر اپنے گھر آتے۔

اور یہ کچھ اُن ہی دِنوں ہُوا تھا جب ثمینہ کے خسر لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر رضا میاں کو اس کا وارث بنا گئے۔

ممکن ہے رضا میاں نے باتوں باتوں میں اپنی بے پناہ دولت کا ذکر کر دیا ہو۔ اور باپ بیٹی کی آنکھیں پھٹ گئی ہوں۔ بہرحال اسی موقعہ کے بعد زیبا جان جان کر رضا میاں کے پاس گھسنے لگیں۔ لیکن وہ طرح دے جاتے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ زیبا کو پسند بھی کرنے لگے تھے۔ اور دِل ہی دِل میں کہیں اس سے شادی کرنے کے بارے میں سوچتے بھی تھے۔ "کیا ہُوا اتنے سارے مرد دو دو چار چار شادیاں کرتے ہیں —— میں بھی اگر ایک اور کر لوں تو۔۔۔۔"

لیکن ایک بات تھی کہ وہ جنسی بدفعلی، عیاشی، بغیر شادی کے جسمانی تعلقات کے بالکل قائل نہ تھے۔ اسی لیے جب کبھی تنہائی پا کر زیبا ان سے چپک چپک جانا چاہتی تو وہ اس طرح دور ہٹ جاتے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

وہ اپنے علی گڑھ کے نفیس لہجے میں کہتے "یہ آپ کیا کرتی ہیں زیبا۔ پلیز۔ اتنے قریب نہ آئیے"

"کیوں میں بجلی ہوں کیا؟ آپ کو کرنٹ لگ جائیں گا کیا میری قربت سے۔"

"جی نہیں، وہ بات نہیں۔ وہ —— وہ ۔۔۔ ۔۔۔"

وہ سوچتے ہی رہ جاتے کہ اس آزاد خیال لڑکی کو کیسے سمجھائیں کہ یہ باتیں مذہب کے خلاف ہیں —— جو کام مذہب کے حدود میں رہ کر بھی کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے لیے گناہ کی راہ کیوں اختیار کی جاتے، خدا کی ناراضگی کیوں مول لی جائے۔

زیبا بہت جھنجھلاتی —— عجیب مرد ہے اِنے —— جوان لڑکی ہاتھ پکڑتا بولتی ہور اِنے پنجے چھڑاتا۔

عورت مرد سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ اس قدر پیار کرتی ہے کہ اپنی ہستی فنا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اس سے ڈرتی بھی ہے کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اور وہ ساری

خوشیاں جو اس کے وجود سے وابستہ ہیں، چھن جائیں۔ اسی لئے وہ اسے پیار سے متانت کر سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے اور کبھی کچھ خامیاں دیکھتی ہے تو نظر انداز بھی کر دیتی ہے۔ لیکن وہی عورت وقت پڑنے پر اتنی بہادر ہو جاتی ہے کہ نہ اس کی ناراضگی کی پرواہ کرتی ہے۔ نہ اس بات سے ڈرتی ہے کہ وہ بچھڑ جائے گا —— جو ہونا ہے میری جوتی سے!

ثمینہ نے ایسی دو ٹوک بات اس دن رضا میاں سے کی کہ وہ دنگ رہ گئے۔ پہلے تو سمجھے ہی نہیں کہ کیا سن رہے ہیں۔

"زیبا سے شادی کب کر رہے آپ؟" وہ اس قدر متانت سے پوچھ رہی تھی کہ انہیں کرنٹ سا لگ گیا۔

انہوں نے بہت دیر تک خاموشی سادھے رکھی۔ یہ بڑا نازک دل لمحہ تھا، اگر وہ کہہ دیتے "کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو! میں اور شادی؟" تو پھر بات عمر بھر کے لئے ہاتھ سے نکل جاتی۔ اور جو عندیہ ظاہر کر دیتے ہیں تو ۔ ۔ ۔

لیکن انہوں نے عقل مندی اسی میں سمجھی کہ ہمت سے کام لیں۔ "ہاں، طے تو کر لیا ہے لیکن یہ نہیں سوچا کہ کب" وہ بے بات انگلیاں چٹخانے لگے ——

"کیا حوصلے کی عورت ہے یہ بھی!" انہوں نے کن انکھیوں سے ثمینہ کو دیکھتے ہوئے سوچا —— ذرا بھی تو نہیں بگڑی —— چہرے کا رنگ تک نہیں بدلا۔

"آپ کر لیو نا —— یہی اِج اگلے ہفتے"

"ایں؟" وہ بُری طرح چونکے —— "یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"کیا ہوا تو۔ کیوں کہ بابا کا چہلم تو کل ہے نا —— پھر بھی آپ کو چھ دن تیاری کو ملتے"

پھر اُن کے جواب سے پہلے ہی بول اٹھی: "جمعہ کا تخد مبارک ہونا ہو لتے۔ جمعرات کو میں یہ پورے بنگلے والوں کو ایک پارٹی دیتی۔ سب کو بلاؤں گی پچاس ساٹھ لوگاں ہو ئیں گے" ذرا رُک کر: "آپ کی شادی کی خوشی میں —— بلاؤں؟ آں؟" وہ بڑی ادا سے جھک کر پوچھ رہی تھی۔

"بس یہی ایک لمحہ ہے، رضا صاحب۔ بھاگو! اس وقت اگر تم پگھل گئے تو کچھ نہ ہو پائے گا۔" اُنہوں نے اپنے آپ کو سمجھایا — اور فوراً اُٹھ بھی گئے۔

"جیسی تمہاری مرضی —"

بڑے سے شاداب لان میں، جگمگاہٹ ہی جگمگاہٹ۔ روشنی ہی روشنی۔ بہترین کھانے دانے اور مشروبات — بے پناہ چہل پہل۔

زیبا نے خاص طور پر نیچی کاٹ والے گریبان کا بلاوز پہنا تھا۔ اور ساڑی اتنی باریک کہ آر پار سب کچھ نظر آئے۔

اپنے اپنے گلاس لئے سب سپ کر رہے تھے کہ ثمینہ بے حد خود اعتمادی کے ساتھ چلتی ہوئی مہمان بیبیوں اور مردوں کے بیچ آ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔

"آپ کو پتہ ہے آج کی پارٹی میں کس خوشی یا کس موقعے پر دی ہوں؟"

سب نے انکار میں سر ہلایا۔

"اصل میں بات یہ ہے کی میں آج رضا صاحب سے طلاق لے رئی ہوں۔"

بے حد بھن بھناہٹ۔ جیسے ہزاروں شہد کی مکھیوں کا شور۔ خواتین کے ہونق اور پریشان چہرے۔ بس ایک زیبا کا چہرہ دمک رہا ہے — ثمینہ نے یہ سب دیکھا اور بات جاری رکھی:

"ایک بات بتاتیوں۔ رضا صاحب کے بابا کا انتقال ہوگیا۔ اُنوں چودہ لاکھ رُپیے کی جائداد چھوڑ کو مرے۔ وہ سب اُنوں کو مِلنے والی نا — اب ایک بات ہور بتاتیوں۔ اُنوں کی جائداد لیلے تو میرے تین بیٹیوں کی اڑچ ہوئی نا؟ پر میں زندگی بھر اُنوں کے ساتھ دھوکا کری سو کری، اب نہیں کرنے والی۔"

سب لوگ کان بن کر سن رہے تھے۔

"میں بے چارے رضا صاحب کی جائیداد کی وارث ان بچوں کو کائے کو بناؤں جو اُنو کے بچے نئیں . . . . . ."

کتنے ہی ہاتھوں سے گلاس چھوٹ گرے۔ رضا میاں چیخ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
"کیا بکتی ہو ثمینہ!"
"آپ میں بچّہ پیدا کرنے کی صلاحیت چھوڑو، عورت کے پاس آنے کی صلاحیت بھی کب تھی جی؟" زیبا نے پھنکار کر رضا میاں کی طرف دیکھا۔ "نامرد! اسی لئے تو میرے خریب نئیں آتا تھا نا!"
"اب لوگاں میں دو پارٹیاں بن گئی تھیں — بلکہ چار۔ دو پارٹیاں وہ جو ثمینہ کی ہمدرد بھی تھیں اور اس سے نفرت بھی کر رہی تھیں۔ دو پارٹیاں وہ جو رضا میاں کی ہمدرد بھی تھیں اور ان سے نفرت بھی کر رہی تھیں۔
"جھوٹ بول کو فائدہ کچھ بھی نئیں۔ میرے تینوں لڑکے الگ الگ مرداں سے ہیں۔ آپ لوگاں غور سے دیکھو تو پتہ چلیں گا کی ایک کی صورت بھی ایک سے نئیں ملتی۔" (وہ دِل میں ہنسی تینوں بچّے پورے پورے باپ پر گئے ہیں لیکن اب سب اپنے اپنے وہم کے مطابق الگ الگ صورتیں گڑھ لیں گے۔)
سب لوگ رہ رہ کر رضا میاں کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"باپ کی اولاد باپ پر اِچ جاتی۔ ہمارے لوگاں کے خاندان میں ایسا دوسرے تیسرے شادیاں کا رواج نئیں بس یہ حیدرآباد کے نواباں اِچ ایسے ہیں تو انوں رضا صاحب کہاں اپنے خاندان کے اثرات سے بچنے والے تھے سو میں منع نئیں کرتی، شوق سے کرو، پر میرے ضمیر کو یہ بالکل گوارا نئیں کی ان بے چاروں کی دولت اپنے حرام کے بچّوں کو دلوا دوں۔ اِتّا پالے پوسے بڑا کرے یہی اِچ بہوت ہو گیا۔"
ایک بیگم نے ذرا تلخی سے پوچھا: "آپ اپنے عیباں کیا بے شرمی سے بتا رئیں — وہ بے چارے کا تو خیال کرے۔" اُنھوں نے رضا میاں کی طرف اشارہ کیا۔
ثمینہ معصومیت سے بولی "اُنوں بے چاروں کا تو عیب چھپانے کو میں زندگی بھر گناہ کری۔ اُنوں نامرد تھے نا جی۔" پھر زہریلی مسکراہٹ سے بولی "ہور ایسے اِچ مرداں اپنا گناہ، اپنا عیب چھپانے کو دِکھاوے کو دوسری شادی بھی کر لیتیں۔"

محفل سے جانے والوں میں سب سے پہلی زیبا تھی۔ رضا میاں کے قریب سے گذرتے گذرتے اُس نے زمین پر تھوکا اور اتنی زور سے کہ وہ سُن لیں، پھنکار کر بولی: "ہیجڑا ـــــ ہونہہ! دولت کی حیدرآباد میں کمی ہے کیا ہے؟"

ایک ایک کر کے سارے مہمان چلے گئے تو ثمینہ ایک ایک قدم گِن گِن کر، ناپ تول کر رکھتی ہوئی رضا میاں کے پاس پہنچی اور دھتکارنے کے انداز میں بولی:

"تمہارے ساتھ خود اپنے آپ کو بھی میں کیوں بدنام کری، معلوم؟ اس واسطے کی تم جل کو، غصہ ہو کو واحنی مجھے تین طلاخ دے دیو۔ تم نا معلوم تو ہونا کی عمر بھر سے اتی محبت کری سو عورت کو چھوڑ کو دوسری شادی کرنے کی بات سوچے بھی تو کیسے۔ میں بھی تو عورت ہوں جو ناگن بھی ہوتی ہور شیرنی بھی۔ اب تمے زندگی بھر کتے بھی شادیاں کرو، زیبا سے تو نئیں ہوئیں گی نا۔ ہور اس جانے میں تو تمہاری بھد ہو گئی! ہور اب میں خود تم پر تین طلاخیں بھیجتی۔

"تھو ـــــ!"

"تھو ـــــ!"

"تھو ـــــ!"

دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے ہوئے رضا میاں چکر پہ چکر کھا رہے تھے۔ آج سے بائیس برس پہلے اُنہوں نے ثمینہ کا تیا پانچا کیا تھا ـــــ وہ زیادہ زوردار تھا یا یہ آج کا تیا پانچا، جو ثمینہ نے اُن کا کیا تھا؟

رنگِ پیراہن

"لیو میاں، اب دُولن کی چاند کے ویسی صورت بھی دیکھ لیو۔"
بھابی ماں نے تو بس یوں ہی کہا تھا جیسا اکثر بیبیاں دُلہن کا چہرہ دِکھاتے وقت ذرا مبالغہ سے کام لیا کرتی ہیں، لیکن تاج نواب چکرا کر رہ گئے۔

گھونگھٹ میں سچ مچ چاند جگمگا رہا تھا! پھر انہیں خبر نہ ہوئی کہ کب آرسی مصحف کی ساری رنگین رسمیں پوری ہوئیں۔ سالیوں نے سلیم شاہی جوتا چھپایا تو اماں بی نے کتنی اشرفیاں نیگ دے کر چھڑایا، میراثنوں کے وداعی بابل پر میکے والیاں تو چھوڑو، خود سسرال والیاں بھی کیسے پھپک پھپک کر روئیں، دُلہن کی حویلی سے اپنی حویلی تک — وہ کیسے پہنچے۔ کسی بات کی انہیں خبر نہ تھی، ہوش نہ تھا۔ ہوش تھا تو بس یہ کہ دُلہن جلیسے تیسے حجلۂ عروسی میں اکیلی ملے اور وہ اسے اپنے آغوش میں بھر لیں۔

لیکن جب وہ اپنی حویلی میں پہنچائے گئے اور دودھ سے دُلہن کے پاؤں دُھلائے گئے تو ایک بار پھر ان کے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔ دُلہن کا چہرہ تو خیر ماہ تاب تھا ہی پاؤں

بھی موتیوں جیسے تھے۔

"یہ بے کار کے ریتاں، رسماں کب ختم ہوئیں گے بھابی ماں؟" انہوں نے ذرا تِلمِلا کر پوچھا تھا۔

اور بھابی ماں نے ہنس کر اپنے رشتے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا تھا "ذرا تو صبر سے کام لیو، میاں ۔ وہ تو ہم نا معلوم اچ ہے کہ صبح کو بے چاری دُولہن کا کیا تو بھی حشر ہو جائیں گا۔"

لیکن وہ حشر ہونے کی نوبت نہ آئی۔

ہوا یہ کہ جب ساری ریتوں رسموں سے فراغت نصیب ہو گئی اور دُولہا میاں نے سہرے تورے اُتار پھینکے تو لپک جھپک کرتی ایک طرح دار سی چھوکری حجلۂ عروسی میں داخل ہو گئی۔ دُلہن کو لمبے چوڑے پھولوں سے سجے چھپر کھٹ پر سر جھکائے، گُرخ گٹھری بنی دیکھ وہ سیدھی دُولہا میاں سے ہی مخاطب ہو گئی۔

"ہو باشا، دُولن بی بی کو سونے سے پہلے "ضرورت" کرا کو لانا ہے کیا؟"

اُس وقت تاج پاشا سر نیوڑہائے، جُوتے اُتار رہے تھے، اُنھوں نے کچھ دھیان ہی نہیں دیا۔

"آپ سُن نئیں رئے کیا؟" "میں کیا پوچھی تو؟" اور اس نے مونہہ پر ہاتھ رکھ کر پہلے تو ایک جماہی لی اور پھر اپنے کمان ایسے بدن کو تان کر انگڑائی لینے کو ہوئی ہی تھی کہ موز بے پرا پنا زور لگاتے ہوئے دولہا نواب سیدھے ہوئے —— اور پھر بات کا جواب دینا ہی بھول گئے۔

"تو کون ہے گے؟" بہت دیر بعد وہ اپنے حواس میں آکر پوچھ رہے تھے۔

اس نے اپنے چاندی کے زیوروں سے لدا بدن چھن چھنا کر ذرا اچنبھے سے کہا "آئی —— آپ کو اتا بھی نئیں معلوم —— دُولن بی بی کے ساتھ کاماں کرنے کو آئی نا اُونوں کے!"

اب لاکھ تاج نواب بڑے مہذب خاندان میں پیدا ہوئے پلے بڑھے تھے، یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ میٹھی ڈش کھانے کے بعد کھائی جاتی ہے، لیکن ایسی مٹھاس سامنے دیکھ کر ان کے ہونٹ آپس میں چپکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات کریں —— یوں ہی خاموش رہ جائیں یا کچھ سلسلہ جنبانی آگے بڑھائیں۔ چھپر کھٹ کی طرف دیکھا تو وہ سُرخ گٹھری یوں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی، مانو جان ہی نہ ہو۔

"کیا گرمی ہے آج —— توبہ! یہ پنکھا جھلانے والا کدھر مر گیا کی" وہ جامہ دار کی اچکن کے بٹن کھولتے ہوئے، یوں ہی بات کرنے کی خاطر بات کرتے ہوئے بولے:

وہ ہنسی —— "ابا —— کیسے ہولے ڈولے میاں ہیں آپ بھی! آج کی رات کوئی پنکھا جھلانے کو آئیں گا کیا —— ہی ہی" وہ اپنی منتھنی والی ننھی سی ناک کو جھوٹی زری کے پلو میں چھپا کر ہی ہی کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

"کیوں؟" وہ ذرا تن کر بولے "آج کی رات میں کوئی کیوں نہیں آئیں گا؟"

"پاشا ——" وہ ذرا تنک کر بولی "میرے کو اتے سارے حکایتاں نکو۔ رات کے معلوم دو بج رئیں۔ چلو آپ بھی سوؤ، ہم نا غریب لوگاں کو بھی سونے دیو۔"

انہوں نے بظاہر بے حد اطمینان سے شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکائی، پھر اسے انہوں نے وہیں چھپر کھٹ پر ڈال دیا تھا، اٹھا کر دیوار والی میز پر دھرا۔ جوتے خود اٹھا کر کونے میں لے جا کر رکھے۔ صراحی سے قُل قُل کر کے پانی نکالا اور کھڑے کھڑے ہی پورا گلاس چڑھا گئے۔

وہ انہیں نیند کے باوجود، انہماک سے یہ سارے کام کرتے دیکھا کی۔ پھر وہ بظاہر اکتائی ہوئی سی، دھیرے دھیرے چلتی دلہن کے پاس پہنچی اور گھونگھٹ میں مونہہ ڈال کر کچھ کھُس پھُس کی۔ گٹھری میں حرکت سی ہوئی اور ہلکے سے سر کے اشارے سے گویا اُسے جانے کا اذن مل گیا۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی دولہا میاں کو اچانک سخت گرمی نے آدبوچا، اور وہ "اُف یہ گرمی تو آج مار اِچ ڈالیں گی!" کہتے ہوئے خود بھی کمرے سے باہر نکل آئے۔

شادی والے گھروں میں ایک خاص وقت تک تو ایسی چہل پہل ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ اب صبح تک کوئی سوئے گا ہی نہیں، پھر یکایک ایسا سناٹا پڑ جاتا ہے کہ جس کو جہاں جگہ ملے، بس خر خر کر رہا ہے ـــــ یہاں سے وہاں تک سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے اس کے پیچھے لپکے اور دھیرے سے پکارا:

"او چھوکری، سن!"

وہ پلٹی، دولہا میاں کو دیکھ کر کچھ حیران سی ہوئی ـــــ ننگے پیروں ہی جو چلے آئے تھے۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

اس نے رات کے دو بجے نام پوچھے جانے پر دبی دبی جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن پھر بھی دھیرے سے بولی "تفریح"۔

دلہن والے کیا ہی باذوق لوگ تھے! ان کے چہرے پر طرارسی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تفریح؟ بھئی واہ! پھر تھوڑی سی تفریح کیوں نئیں ہو جاتے ـــــ آں؟"

شاید اس کے لئے یہ بات زیادہ حیران کن نہیں تھی۔ عجیب سے لہجے میں بولی:

"آپ جاؤ نا پاشا دولن بی بی کے پاس۔ ہم غریب لوگاں تو ویسے بھی آپ کے غلاماں ہیں اِچ"۔

لیکن وہ اس وقت ایسی زبردست تفریح کے موڈ میں تھے کہ ایسی باتیں انہیں روک نہیں سکتی تھیں ـــــ مہدی اور چنبیلی کی جھاڑیوں کے پاس ہری بھری دبیز اور گداز گھاس کا ایک قطعہ نسبتاً اندھیرے میں بھی تھا اور بستر کا کام بھی دے سکتا تھا۔

کوئی چار بجے کے قریب جب دُولہا میاں خوشبوؤں بھری خواب گاہ میں پہنچے، تو انہیں ایسا لگا جیسے دُلہن کی نشست کی ترتیب کچھ بدل سی گئی ہے۔ وہ گئے تھے تو اُس وقت دُلہن کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی، لیکن اس وقت وہ دروازے کی طرف موتہہ کئے ہوئے تھی —— حالاں کہ سَر ابھی تک جھکا ہوا ہی تھا۔

باہر چند منٹ پہلے جو کچھ ہوا تھا وہ اس لئے قابلِ غور نہ تھا کہ ایسا زندگی میں اب تک کئی بار ہو چکا تھا۔ لیکن اب جو ہونے والا تھا وہ بہت اہم تھا۔ اس لئے کہ شادی، اور وہ بھی شریفوں میں، زندگی میں ایک ہی بار ہوتی ہے۔

عُود، اگر اور مہندی کے عطر میں بسی دُلہن ان کے حواس کو گُم کئے دے رہی تھی — ویسے بھی ایک جام چڑھا لینے کے بعد عادی شرابی کو دوسرے جام کی طلب اور بھی بے حال کر دیتی ہے —— وہ وہیں دھیرے سے چھپر کھٹ کی پٹی سے ٹک گئے، اور دھیرے سے دُلہن کو ہاتھ لگایا۔

"اب تم برائے مہربانی پھر کبھی اس چھپر کھٹ پر نہ بیٹھنا، نا میرے کو کبھی ہاتھ لگانے کی کوشش کرنا۔"

سہاگ رات، کہتے ہیں سَراسَر عورت کی ملکیت ہوتی ہے، اس کا اپنا اثاثہ، اس کا اپنا خواب۔ اس کی زندگی کا سارا حسین ترین نچوڑ —— عورت سہاگ رات کے بارے میں کنوارپن میں جتنا کچھ سوچتی ہے، مرد اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں سوچ سکتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مرد تو شادی سے پہلے ہی کئی سہاگ راتیں منا چکا ہوتا ہے لیکن ایک شریف لڑکی کی زندگی کا یہ اچھوتا، کنوارا، پاکیزہ اور پہلا خواب ہوتا ہے، جو حقیقت بن جانے پر بھی زندگی بھر اس کے لئے ایک دِل کش خواب ہی کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی مرد کے لئے بھی یہ رات اپنی جگہ بڑی حسین اہمیت رکھتی ہے، جب وہ یہ سوچتا ہے کہ حجلۂ عروسی میں داخل ہونے پر، پہلے تو کسی حسینہ کا گھونگھٹ اُٹھائے گا، اس کا صبیح اور پاکیزہ چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے گا

شرم سے مُندی ہوئی آنکھیں کھلوانے پر اصرار کرے گا، منت کرے گا۔ ساری عمر غلامی میں گزار دینے کے جھوٹے سچے وعدے کرے گا، اور پھر بالآخر اس جسم کا مالک ہو جائے گا۔ جو نکاح کے چند بولوں کے بعد سے، آئینے میں اپنی جھلک دِکھلا کر متواتر اسے بے قرار کئے جا رہا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ قطعاً نہ ہوا۔ شرم و حیا سے بند آنکھوں کو کھلوانے کی منت سماجت تو دُور رہی وہاں تو ایک جھٹکے سے خود ہی دُلہن نے زرتار مہرا اُٹھا کر چہرے کا چاند سامنے کر دیا۔

تاج نواب نے عورت کا یہ رُوپ تو کبھی نہ دیکھا تھا۔ حسین عورتیں تو بہت دیکھی تھیں لیکن اس حُسن پر یہ تیہا! وہ اسے بھی حُسن کا ایک انداز ہی سمجھے۔ مُسکرا کر بولے "آپ کو ہاتھ لگانے کی اجازت تو مذہب دیا، خدا دیا، اس کا رسُول دیا۔" دُلہن بیگم نے ایسی نِگاہوں سے اُنہیں دیکھا کہ ان کا سارا وجود ڈول گیا۔ گھبراہٹ چھپانے کو ہنس کر بولے: "میں بھی تو سُنوں آپ اِتا غصّہ کائے پر ہو لے رئیں؟"

وہ دھیرے دھیرے پلنگ سے اُترنے سَرکنے لگیں۔ سونے کے گھنگرو حرکت پا کر چھنکنے لگے۔ پھر وہ چھن چھناتی، تن تناتی چھپر کھٹ سے اُتر کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں مہرے کے نیچے باریک جال دار دوپٹہ چمکیوں اور زری سے جھم جھما رہا تھا ——— انھوں نے مہرا اُتار کر ایک جھٹکے سے وہ باریک جال دار دوپٹہ بھی اُتار پھینکا۔ اب ان کا پُرکشش اور اُبلتا ہوا شباب سامنے تھا۔ سُرخ منڈھے ہوئے کُرتے میں جیسے مدوجزر آیا ہوا تھا ——— وہ ہیروں بھری نتھ پہنی ہوئی خوددار ناک کو ایک تیہے کے ساتھ چڑھا کر اُن سے گویا ہوئیں:

"حیدرآباد میں آئینوں کی کمی نئیں ہے۔ آئینے میں بھی دیکھتی رئی ہوں۔ حویلی میں بہوت ہئیں۔ میرے کو معلوم ہے مئیں کیا ہوں۔ جیسا حسن اللہ میاں میرے کو دیا، جیسی مونہہ زور جوانی وہ مالک میرے کو دیا۔ جیسا سراپا میرے کو دیا، اِتا شاید پورے حیدرآباد کے حسین لڑکیوں کو ملا کر بھی نئیں دیا ——— اِتا عورت ہوں کر کے جانتی ہوں کہ تم خاردان ہوتے

ہور میرے جسم کی شراب کا ایک گھونٹ بھی پی لیتے تو پھر دنیا میں کچھ یاد نئیں رہ جاتا۔ یہ مت سوچو کی عورت ہو کو، ہور خود اپنے مونہہ سے کیسی باتاں مَیں کر ری۔ عورت ایک کتاب ہوتی۔ کوئی کتاب خود اپنے آپ کو نئیں پڑھ سکتی۔ پر عورت کو اللہ ایک ایسی کتاب بنایا کی وُ اپنے ایک ایک حرف سے خود آگاہ رہتی، مَیں تم کو بتاوں؟ جب کبھی مَیں نہا کو حمام سے اپنے کمرے میں آتی اور قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو غش غش کرتی، پھر گھبرا کر خود اچ تواں جلدی سے لپیٹ لیتی کی اپنے آپ پو عاشق نہ ہو جاوں۔ ہور پھر قدرتی طور پر ایک خوب صورت جذبہ شرم کے ساتھ دل پر حاوی ہو جاتا کی یہ سوب تمہارا ہے، کیوں کہ معلوم تھا کی پانچ سال سے تمہاری منگیتر تھی۔ تم میرے کو نئیں دیکھے تھے، مَیں بھی تمہارے کو نئیں دیکھی تھی، معلوم تھا کی مَیں جو ایک چاند ہوں، کس کے آنگن میں جگمگانے والی ہوں —— جو اسکول میں پڑھنا لکھنا سیکھی، حویلی میں سوب کاماں کاجاں سیکھی کائے کو؟ اپنا ہر ہر لمحہ کس کے انتظار میں گزاری؟ تمہارے نا؟ مگر پتہ چلا کی تم موری کے کیڑے ہے —— جاؤ مہتری ہور چنبیلی کے پاس ہری گھاس کا بچھونا تمہارے واسطے بچھا ہے کہ تم جیسوں کی اوقات اچ وئی ہے۔"

دولہا میاں نے گھبرا کر کچھ کہنے کو مونہہ کھولنا چاہا تو وہ نفرت سے ناک سکوڑ کر بولیں:

"دل میں کتے ارماناں نئیں ہوئیں گے میرے کیا کیا خواب نئیں دیکھی ہوئیں گی مَیں نے —— سوب نیلام کر ڈالے تھے۔ ننگے پاؤں نکل کو چلے گئے، ایک دو ٹکے کی باندی کے پیچھے۔ میرے کو ایسا بے عقل مت سمجھو۔ حمام کو بازو اچ تھا۔ جاتے تو آواز نئیں آتی تھی کیا؟ خالی کمرہ دیکھ کر مَیں کھڑکی تک پہنچی تو وہ دیکھی جو زندگی بھر سوچ بھی نئیں سکتی تھی۔ تھو! لعنت! جس ہونٹاں سے تم میرے جوتیاں اٹھانے والی کو پیار کرے، وہ ہونٹاں مَیں اپنے مونہہ کے قریب بھی کبھی لانے دیوں گی۔ میرے خواباں میں بسا ہوا تمہارا وہ شہزادہ کے

ویسا جسم میں وہ مہترانی سے چپکا ہوا دیکھی، اب یہ جسم میرے پر حرام ہو گیا ــــ بول دی میں۔"

دولہا میاں میں کچھ بولنے بتانے، معافی مانگنے تک کا حوصلہ نہ رہ گیا۔ دُلہن بیگم نے ایک تنا کے سے مخمل کا ایک تکیہ گھسیٹا اور نیچے قالین پر ہی پڑ گئیں۔ دولہا میاں چھپر کھٹ کی پٹی پر ٹکے ان کی بے قابو اور بے پناہ جوانی کا زور دیکھتے رہے ــــ ان کا بے پناہ حُسن، ان کا توبہ شکن سمندر کی طرح اُبلتا ہوا شباب، ان کا غصّے سے بپھرا ہوا سُرخ و سفید رنگ بدلتا ہوا چہرہ، ان کا زیوروں سے لدا جوان جسم، زیوروں سے پھوٹتی چھن چھنا چھن۔ ان کے بے پناہ گھنے لمبے اور جھومر ٹنکے بالوں سے اُبلتی مست کرنے والی خوشبو ــــ وہ دیکھتے رہے، ترستے رہے، لیکن پاس پھٹکنے کی ہمّت نہ پیدا کر سکے۔ پھر بھی دل میں سوچتے ضرور رہے:

"آخر کو عورت ارچ تو ہے، کاں تک غصہ کریں گی۔ جلدی کیا تو بھی ہے۔ منالیں گے، منالیں گے۔"

لیکن تاج نواب سخت غلط فہمی کا شکار تھے، وہ سوچ رہے تھے، پہلی رات تو جیسی تیسی گزر گئی، گزر گئی، دوسری تو اپنی ہی ہو گی ــــ لیکن دوسری رات اس سے بھی بدتر آئی ــــ

صبح صبح تو وہ یہ منظر دیکھ کر کمرے سے نکل کر چلے گئے تھے کہ ساری لڑکیاں بالیاں جوان عمروں کی بھابھیاں، سہیلیاں دُلہن کو گھیرے میں لئے گندی گندی باتیں کر رہی ہیں رات کی واردات پوچھ رہی ہیں اور دُلہن سر جھکائے گھٹنوں میں موہنہ دئے بیٹھی ہے۔

پھر رات کا کھانا دولہا میاں کا، ان کی سسرال میں تھا۔ چوتھی کا کھانا ــــ وہاں لے ہنگ ہوئی۔ سالیوں نے اور دوسری رشتہ دار لڑکیوں نے انہیں خوب خوب ستایا۔ دُنیا بھر کی ایجو ایک سبزی جمع کر کے رکھی تھی کم بختوں نے مار مار کے ان کے کپڑوں کا تیا ناس

کر دیا۔ خوب ہُلّڑ ہوا جب اپنی حویلی کو چلنے کو ہوئے تو انہوں نے سُنا دُلہن امّی سے کہہ رہی تھیں :

"امّی، میرے کو ایک سفید جوڑا دیتے آپ۔"

"اَئی چھوکری، ہَولی ہو گئی کیا۔ کل کی دُولن آج کتے سفید کپڑے پہنتی۔ عقل ہے کی نئیں؟"

"جی نئیں، امّی۔ میرے اِتّی بات نکو ٹالو آپ ——"

"اگے بیٹا اب مَیں کال سے تو بھی لا کر دیوں مُوئے سفید کپڑے۔

"کیوں میرے اسکول کا شنبہ (سیٹرڈے) کا یونیفارم نئیں ہوئیں گا کیا؟"

واپس آ کر دُلہن نے سفید ململ کا دوپٹہ، سفید کرتا، سفید پاجامہ پہنا۔ ان کے گھٹاؤں جیسے بال تاج نواب کا صبر لوٹنے لگے۔ وہ ذرا آگے بڑھے تو وہ پھن پھناتی ناگن بن کر بولیں :

"اب تو میں رنڈاپا بھی چڑھا لی۔ میرے حسابوں تم ختم —— تم بھی میرے پو فاتحہ پڑھ دیو۔"

"دیکھئے غلطی ہو گئی۔ ایسا بھی کیا۔ معاف کر دو نا۔"

وہ کھُلے دِل سے بولیں "تم بولتے تو معاف کر دیتوں۔ مگر یہ معافی ایسی ہے کی جوان جوان آدمی کو عورت کا ساتھ تو ہونا اِچ۔ تو جاؤ جدھر جی چاہے مونہہ مارتے پھرو۔ میری طرف سے کوئی مناہی نئیں۔ مگر میرے کو ہاتھ نئیں لگانا —— ہور لگائے تو پھر نتیجہ دیکھ لینا۔"

اب یہ اللہ معلوم کہ نتیجے سے ان کی کیا مُراد تھی، لیکن تاج نواب اچھے خاصے دھاکڑ مرد ہوتے ہوئے بھی پھر انہیں چھونے کی، ہاتھ لگانے کی ہمّت نہ کر سکے۔

نئی دُلہن، سفید پہناوا، دُولہا سہمے سہمے —— بات چھپی کیسے رہتی؟

ساس نے دُلہن سے پوچھا : "اَئی دُلہن پاشا تم پڑھے لکھے ہے، مَیں نے مانی۔ مگر

ایسا بھی کیا ماں .... "

کہاں تو حیدرآباد کی دُلہنوں کی پانچ جمگلیوں تک ساس سے شرم تک نہ ٹوٹی تھی، بات تک نہ کرتیں، یہاں دُلہن بیگم نے بے حد صفائی سے جواب دیا "اماں جانی، آپ کے بیٹے پہلی اچ رات کو تفریح کے ساتھ تفریح منالیے۔ اب میں زندگی بھر ان کو ہاتھ نہیں لگانے دیوں گی۔"

اماں جانی بے چاری موئے موہنہ کی تھیں، پھر اپنے میاں کے زندگی بھر یہی رنگ ڈھنگ سہتی رہی تھیں —— ایک طرح خوش ہی ہوئیں کہ چلو اپنا بدلہ کوئی عورت لے تو رہی ہے۔ پھر کچھ نہ بولیں۔

یہ عجیب و غریب واردات تھی —— سارے اونچے اونچے گھرانوں میں بات پھیل گئی کہ نواب تاج یار جنگ کی پہلی رات کی بیاہی نے دولہا میاں کو جھٹک دیا ہے۔ ہاتھ تک نہیں لگانے دیتی۔ لیکن عجیب و غریب عورت تھی۔ کبھی تو شوہر کی کسی بات میں کمی نہ آنے دی، ناشتے سے لے کر دوپہر کے کھانے تک، پھر چائے، ہلکے سہ پہری ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک سارا اہتمام اپنے ہاتھوں، پھر میاں کے آنے جانے والے مہمان۔ پھر میاں کی "راتوں" کی تیاریاں۔ کوئی مجرے والی آگئی تو رات بھر کے رت جگے کی ہر چھوٹی بڑی تیاری۔ کھانے پکوا رہی ہیں، چاندنیاں بچھوا رہی ہیں۔ مہمانوں کے لئے پکوان، تلن کوئی ناچنے والی آگئی تو بھی سارے اہتمام خود ہی کراتی پھر رہی ہیں اور جب یہ پتہ چلتا کہ آج "رات گزاری" کے لئے کوئی باہر والی آنے والی ہے تو میاں کے کمرے کو دلہن کی طرح آراستہ کراتیں۔ خود تو مدت سے الگ کمرہ بسا چکی تھیں۔ یہی خیال رکھتیں کہ کوئی کمی اور کسر نہ رہ جائے —— حالاں کہ محل والوں کا سدا یہ دستور رہا کہ طوائفیں آتیں تو باہر ہی ٹھالی جاتیں، گھر کے برتن تک اُن کے استعمال میں نہ جانے پاتے لیکن وہ تو باقاعدہ ان کو گھر والیوں کا درجہ دینے پر تُل جاتیں —— خوب نمازیں پڑھتیں۔ قرآن شریف کے

دَور پہ دَور ختم کرتیں۔ اپنے 'گناہ' کے کفارے کے طور پر بے پناہ خیرات کرتیں

کوئی انہیں ٹوکتا تو چڑ کر بولتیں "کیوں اُنوں میرے خرچے پانی کو کوتی کمی کرے؟ کبھی میرے مطالبات میں غفلت برتے؟ کبھی میری کوئی بات پر پابندی لگائے؟ پھر میں کاہے کو ان کو ٹوکوں؟ ہو بس ایک بات نئیں ہوتی، سو نئیں ہوتی۔ ہور زندگی بھر انشاء اللہ ہوئیں گی بھی نئیں۔"

اب کچھ دن سے وہ سفید ساڑی، سفید لمبی آستین کا بلاؤز پہننے لگی تھیں۔ اُس دِن نہا کر اٹھیں تو کالے لمبے گھٹنوں تک آئے ہوئے بال، سفید پاکیزہ چہرہ، سفید لباس —— بس جنت سے آئی ہوئی کوئی حُور لگ رہی تھیں۔

نواب باہر سے آئے تو انہیں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پھر بڑی لجاجت سے بولے "اب تو کتے سالاں گزر گئے —— اب تو معاف کردیو۔" ان کی پیاسی نظریں اُن کے جوان کمان کی طرح تنے ہوئے جسم کو ٹٹول رہی تھیں۔

دوسرے دِن سے انہوں نے نوکرانیوں سے کہہ دیا "مَردوے گھر کے اندر آنے والے ہوں تو گوشے کو بول دیا کرو۔" مَردوے سے مُراد صرف تاج نواب تھے اور پھر وہ باقاعدہ شوہر سے پردہ کرنے لگیں۔

پورے پندرہ سال گزر گئے لیکن نہ ایک بال سفید ہوا نہ وہ کسا ہوا جسم ہی ڈھلا۔

پندرہ سال ——!

کیسے گزرے ہوں گے بن باس کے وہ پندرہ سال؟ یہ کوئی اُس بدن سے پوچھتا جو آتی ہی تپش اور آگ میں جھلس جھلس کر عود کی طرح خوشبو دینے لگا تھا۔ جاڑے، گرمی، برساتیں، کیسے کیسے موسم اِس جسم پر سے ہو کر گزر رہے تھے اور ایسی اُبلتی جوانی کہ چٹان پر بھی ایسی جوانی آتی تو وہ اپنی مارے چٹخ پڑتی۔ جلتی لکڑی پر کوئی پانی کا چھینٹا مارے تو "سَن" کی ایک جان لیوا آواز نکلتی ہے۔ ان کا بدن رات دن ایسی جلتی لکڑی بنا رہا جس پر برہا کے چھینٹے "سَن

سن" پیدا کر رہے تھے۔ پھر کنوار پن کے پانچ سال جس ایک ہستی کے تصور میں اپنے آپ کو سپرد کرنے کے تصور میں گزارے، اپنے آپ کو دل کش بنانے کے جتن میں گزارے کہ ملتی سے کہہ کہہ کر بالوں کو لانبا، گھنا، خوب صورت بنانے کے لئے میتھی، بیری، ماش پیس پیس کر کنیزوں سے بھروا رہی ہیں، سنترے کے چھلکے اور ماش، چنے کے دانوں کو لیموں میں پیس کر چہرے کو چاند اور جسم کو کندن بنا رہی ہیں کہ کوئی دیکھے اور مر مٹے اور وہ خود بھی مر جائیں۔
وہ موت ان کا مقدر نہ تھی ——

برسوں تک شوہر سے ان کا باقاعدہ پردہ جاری رہا، مگر اُس دِن کسی نے باہر سے پردے کا سندیسہ نہیں کہلوایا، کیوں کہ مردانے میں نواب تاج یار جنگ کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ اچانک ہی ان پر دل کا دورہ پڑا۔ کسی سے کچھ کہا نہ سُنا اور آنکھیں بند کرلیں۔

محل میں کہرام مچ گیا —— ابھی عمر ہی کیا تھی اُن کی۔ دیکھنے میں تو بالکل جوان لگتے تھے۔ جہاں جہاں خبر پہنچی، ایک ایک کر کے حویلی بھر گئی۔

دُلہن بیگم نے اپنے کمرے کے کواڑ بند کر لئے۔ لوگوں نے دروازے پر کتنی ہی دستکیں دیں، مگر انہوں نے پٹ نہ کھولے۔

تباہ حال ساس نے روتے روتے بھی لوگوں کو ہی منع کیا:

"رہنے دیو —— دُکھوں کی ماری نے کیا تو بھی سکھ دیکھی بول کے اب میت تبا رئے —— ہور بھی یو ملے گی۔"

لیکن جب جنازہ اُٹھانے کا وقت قریب آیا تو سب لوگ دنگ رہ گئے —— دروازہ کھلا —— اور سہاگ رات کی زرتار سُرخ جوڑے میں دُلہن بیگم کمرے سے پورے سولہ سنگھار کے ساتھ برآمد ہوئیں۔ سب سمجھے دماغ چل گیا ہے۔ لوگ رونا دھونا بھول کر انہیں دیکھنے لگے۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے سب کو دیکھتے ہوئے بولیں:

"حیرت نکو کرو —— آج دراصل اُنوں میرے اپنے ہوئے۔ آج کے دِن تک دوسرے عورتاں کے کتھے اُنوں، پر آج کے بعد میرے کو یخین ہے کوئی حرام زادی نہ اُن پو ایک درُود پڑھ کو بخشیں گی، نہ اُن کو یاد کرے گی۔ اب اُن پو پُورا پُورا میرا حق ہے۔ آج میں اصل میں نوے سرے سے ان کی دولن بنی ہوں۔ آج کے بعد سے اُنوں خود کسی کو ہاتھ لگائیں گے، نہ کوئی ان کی زندگی میں رہیں گی —— اب میں کیسا ان کا ساتھ چھوڑ سکتی ہوں ؟"

اور انہوں نے سر پر زرتار جھرزر کا سُرخ پلّو جما کر قرآن شریف پڑھنا شروع کر دیا۔

زکوٰۃ

چاند آسمان پر نہیں نیچے زمین پر جگمگا رہا تھا! نواب زین یار جنگ کو برسوں پہلے کسی شادی کی محفل میں ڈھولک پر گاتی ہوئی میراثنوں کے وہ بول یاد آ گئے:

کیسے پاگل یہ دُنیا کے لوگاں ماں۔
چھت پر کائے کو تو جاتے یہ لوگاں ماں۔
آنکھاں کُھلے رکھو تا کا جھانکی مکو۔
اپنے آنگن کو دیکھو ماں —— چندا سجا کیسے پاگل۔

واقعی وہ پاگل ہی تو تھے۔ اب یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا کہ اتنے زمانے سے اس حویلی میں رہ رہے تھے، اور اب تک یہی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ چاند آسمان پر ہی نہیں زمین پر بھی چمک سکتا ہے۔

عید کی آمد آمد تھی —— کل بھی ساری حویلی کے لوگ چاند دیکھنے کے لئے چھت پر چڑھے تھے —— نواب صاحب کی کچھ تو عمر بھی ایسی تھی، کچھ عید کی خُوشی بھی انہیں نہ ہوتی تھی

کہ روزے نمازوں سے وہ اللہ تعالےٰ کے پاس سے معافی لکھوا کے لائے تھے۔ عید کے چاند کی اصل خوشی تو اُن روزداروں کو ہوتی ہے جو رمضان بھر کے پورے روزے رکھتے ہیں۔ وہ چھت پر جاتے بھی تو کیوں؟ لیکن آج سب نے ہی ضد کی ـــــ یہاں تک کہ حویلی کے مولوی صاحب نے بھی کہا "مبارک مہینوں کی پہلی کا چاند دیکھنے سے بینائی بڑھتی ہے اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔" تو وہ برکتوں کے نزول سے زیادہ بینائی بڑھانے کے لالچ میں اوپر چلے آئے، کیوں کہ آج کل وہ واقعی آنکھوں کی کمزوری کا شکار ہو رہے تھے۔ عمر تو یہی کوئی چالیس بیالیس کے قریب تھی۔ وہ منزل ابھی نہیں آئی تھی کہ ان پر ساٹھے پاٹھے کا اطلاق ہونے لگتا، لیکن جوانی کو وہ شروع جوانی سے ہی یوں دل کھول کر لٹاتے آرہے تھے کہ اکثر اعضا کس بل کھو چلے تھے۔ یوں اپنے حسابوں وہ ابھی تک خود کو بڑا دھاکڑ جوان سمجھتے تھے لیکن خواب گاہ سے نکلنے والی طرار اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی ہوئی خواصیں دوپٹوں میں مونہہ چھپا چھپا کر ہنس ہنس کر ایک دوسری کو راتوں کی واردات سنائیں تو دبے چھپے الفاظ میں ان کی جوانی کا پول بھی کھول کر رکھ دیتیں۔

"اُجاڑ پتہ اِچ نئیں چلا کی رات کدھر گزر گئی ـــــ"

"کیوں؟" کوئی دوسری پوچھتی "اِتنے لاڈاں ہوئے کیا؟"

"لاڈاں؟" وہ ہنس کر کہتی "اَگے جو جا کو سوئی تو بس سوتی اِچ رہی ـــــ اُجاڑ دم ہی کیا ہے بول کے اُونں میں۔"

کوئی یوں ہی سر جھاڑ مونہہ پہاڑ گھومتی تو دوسری ٹھیلتی "اگے غسل نئیں کری کیا میں ابھی حمام میں گئی تھی تو پانی گرم کا گرم ویسا چ رکھے وا ہے۔"

وہ الجھ کر بولتی "باوا بور بھایاں بن کے کوئی مرد سوئیں گا تو کائے کا غسل اور کائے کی پاکی؟"

لیکن ان تمام باتوں سے نواب صاحب کی جوانی پر کوئی حرف نہیں آتا تھا۔ آخر

حکیم صاحب کس مرض کی دوا تھے؟ اور پھر حکیم صاحب کا کہنا یہ بھی تھا کہ "قبلہ آپ زیادہ سے زیادہ نوخیز چھوکریاں حاصل کرنا۔ ایسا کرے اچ تو اچ آپ کو زیادہ خوت ملتی ہور آپ زیادہ دناں جوان رہتے۔"

لیکن اس وقت نواب صاحب کا چھت چاندنی پر جانا قطعی کسی بُری نیت سے نہ تھا۔ وہ تو واقعی عید کا چاند دیکھنے کے لیئے اُوپر چڑھے تھے۔ چاند واند تو نہیں کیب نظر آتا، جس نے بھی جدھر اُنگلی اُٹھادی "ہو ہو — جی ہو — جی ہو" کرکے اُدھر ہی نظر جمادی۔ لیکن اچانک اپنی بلند بانگ حویلی کی آخری اور ساونچی چھت پر سے اُن کی نظر پھسلی اور نیچے کی غریبانہ مگلی (جھونپڑی) کے آنگن میں ٹھیر گئی — آنکھیں کم زور تھیں ضرور کم زور تھیں۔ پہلی کا چاند یقیناً نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن چودھویں کا چمچماتا چاند سامنے ہو تو کم زور بنیائی والی آنکھیں خود بھی جگمگانے لگتی ہیں۔

"کیسے پاگل تھے ہمیں — اِتنے دناں ہو گئے ہور یہ بھی نئیں معلوم کرے کی اس پڑوس کیسا ہے اپنا۔"

دیوان جی سامنے ہی کھڑے ہاتھ مل رہے تھے۔

"آپ تو کبھی ہم نا بولنا تھا کی پڑوس میں خیامت ہے۔"

"جی — جی — وہ — وہ سرکار میں کبھی غور نئیں کرا۔"

"آپ کو غور کرنے کی ضرورت بھی نئیں، بس آپ کیسا تو بھی کرکے، وہ لڑکی حاضر کر دینا۔ فخط اتاچ کام ہے آپ کا۔"

دیوان جی پلٹے تو انھوں نے پاس والی دراز کھولی اور کھن کھناتے کلدار چالی روپوں سے بھرا بٹوہ اُچھال کر دیوان جی کے پیروں میں پھینکا۔

"ہم مُفت میں کوئی چیز نہیں لیتے۔ وہ چھوکری اگر چوں چرا کری۔ یا ماں باپ اگر مگر کرے تو یہ روپے پکڑا دینا — ان لوگاں زندگی بھر کھائیں گے تو بھی اِتے روپے

ختم نہیں ہوئیں گے۔"

لیکن دوسرے ہی دن دیوان جی پھر اسی طرح کھڑے تھے۔ ہاتھ ملتے ہوئے خالی روپیوں کا توڑا انہوں نے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"سرکار..." ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ "اُتنے —— اُتنے... ..."

"یہ اُتنے اُتنے کیا کرے آپ؟" سرکار اُلجھ کر بولے "جو بات ہے، صاف بولئے۔ ہوا کیا نئیں کچھ؟"

"سرکار وہ لوگاں بہوت ہی بہوت شریف لوگاں نکلے۔ بولنے لگے" روپے پیسے ہیں بیٹیاں کیسیاں بیچے۔ ہم شریف نمازی اللہ والے لوگاں ہیں۔ ہماری بیٹی کو ہم اللہ رسول کے بتائے خاتون کے مطابق عقد خوانی کر کے وداع کریں گے۔ ہور... ہور... سرکار اتا وزنی توڑا اُٹھا کے اتوں میرے مونہہ پو پھینک مارے۔"

نواب صاحب دانت پیس کر بولے "تو آپ انسان کی اولاد بولتا تھا نئیں کی ایسا ہے تو عقد میں دے دیو۔"

دیوان جی لرز گئے —— نواب صاحب انتہائی غصّے کی حالت میں ہی انہیں بجائے گالی دینے کے انسان کی اولاد کہا کرتے تھے جو ہزار گالیوں سے بدتر گالی تھی۔

"بولا سرکار۔"

"پھر اُن لوگاں کیا بولے؟"

"بولے —— بولے سرکار کی عمر بہت ہوتی۔ ہماری بچّی کچی عمر کی ہے۔"

اس وقت دیوان جی کے مونہہ سے "کچی عمر" سن کر نواب صاحب کے انگ انگ میں خون بول اُٹھا۔ ذرا بھنا کر بولے "ہم آپ نا زیادہ عمر کے دکھتے جی؟"

"نئیں سرکار" دیوان جی چاپلوسی سے بولے "ایسی بھی کیا عمر ہوئیں گی آپ

کی۔ ایسے ایسے تو کتے پوٹیاں آپ .... " پھر وہ ادب تہذیب کا خیال کر کے چپ ہو گئے لیکن نواب صاحب کی باچھیں کھِل گئیں۔ وہ مُسکرائے۔

"وُوئی اچ تو ہم بھی کہہ رہے تھے —" اچانک وہ پھر سے سنجیدہ ہو گئے " مگر وہ چھوکری کیسا تو بھی ہم کو مِلنا "

"آپ عقل والے ہیں۔ سرکار آپ سوچو۔ ہم غریب کم عقل لوگاں — آپ جیسا حُکم دیئے ویسا بجا لائے — بس —"

"یہ پتہ چلاؤ آپ کی گھر میں کِتّے لوگاں ہیں —"

"وہ میں چلا لیا سرکار —" دیوان جی جلدی سے بولے " ماں ہے، بیمار باپ ہے — چل پھر نہیں سکتی، سو دادی ہے۔ ہور تین چار چھوٹے چھوٹے بھایاں بہناں ہیں — یہ اُجالا اچ سب سے بڑی ہے "

نواب صاحب کا ذہن جیسے روشن ہو گیا۔ اُجالا — اِتّا خوب صورت نام! بے تابی سے بولے " جیسا مونہہ ویسا اچ نام "

"جی ہو سرکار، سچ مچ اُجالا اچ ہے۔ ہندھارے (اندھیرے) میں بھی بیٹھے سو اُجالا ہو جاتا .... "

"آپ چُپ اس کے تعریفاں نکو کرو جی، نواب صاحب جل کر بولے " آپ اب یہ کرو کی ان لوگاں کو جا کو بولو کی نواب صاحب آس پاس کے پورے گلیاں توڑ کو پکّا احاطہ بنوا رئیں۔ بول کو یہ جگہ کل شام تک اچ خالی کر دینا "

دیوان جی خوش ہو کر بولے " جی ہو سرکار! بہت اچھی بات سوچے آپ — اتّا بڑا اکنبہ لے کو نِکل کو کہاں جائیں گے بدبختاں — جھکنا پڑے گا "

عید کے دن روتے دھوتے میاں بیوی سرکار کے حضور میں پیش ہوئے۔

"حضور ـــــ سرکار ـــــ آپ کے خدموں میں زندگی کٹ گئی - اب کدھر جانا؟ بڈھی ماں ہے - اُٹھ کر اپنے آپ سے بیٹھ بھی نہیں سکتی - یہ مرد میرا کب سے دِرخ کا بیمار ہے ـــــ چھوٹے چھوٹے بال بچے - آپچ بولو سرکار - کاں جانا ـــــ" سکینہ بی رو رو کر کہنے لگی -

"ہمارے حویلی کے نوکر خانے میں بہوت جگہ ہے - یہاں آجاتے" نواب صاحب نرمی سے بولے -

اپنے بیمار شوہر پر نظر پڑتے ہی اس کا حوصلہ جواب دے گیا -

"احسان ہے سرکار کا ـــــ سچی بولتی ساری رعیت کی حضور بڑے دِلوال ہیں"

اور یہ حقیقت بھی تھی کہ نواب زین یار جنگ سے بڑا دِل والا اُن سے زیادہ سخی، ان سے زیادہ دِلوال، کوئی نواب حیدرآباد نے پیدا نہیں کیا ـــــ لینے سے انہیں سخت چڑ تھی - خود اپنے رشتہ داروں، عزیزوں سے بھی زندگی میں کبھی ایک پائی کا تحفہ قبول نہیں کیا - سدا ہاتھ اُٹھا ہوا ہی رہا تھا، لیکن صرف دینے کے لئے - دینے میں تو اس حد تک پہنچے ہوئے تھے کہ ان کے ہاتھوں سے کتنی ہی قیمتی چیز کیوں نہ گر جاتی، کبھی جھک کر اُٹھاتے بھی نہ تھے ـــــ ملازموں سے اُٹھواتے اور پھر ان ہی کو بخش بھی دیتے -

سوداگروں کا ایک خاندان حیدرآباد میں مدتوں راج کرتا رہا - اتنی دولت سوداگروں کے خاندان میں آئی کہاں سے؟ ہُوا یہ تھا کہ ایک بار ان ہی نواب صاحب کے ہاتھوں سے بچپن میں سونے کی جگہ مگر اشرفیوں سے بھری تھیلی چھوٹ کر زمین پر گری - سخاوت تو بچپن سے ہی گھول کر پلائی گئی تھی - جھکنا بھی کبھی نہ جانا تھا - ملازم کو بُلایا اس نے تھیلی اُٹھا کر دینا چاہی تو غصے سے بولے "گرا ہوا مال ہم نا دیتا ہے نامعقول ـــــ نکل جا ابھی حویلی سے - ہور یہ تھیلی بھی لیتا جا"

تھیلی کے ساتھ جیسے اس کی خوش بختی بھی لگی تھی ـــــ بعد میں کہتے ہیں اس نے

کوئی کاروبار کیا اور خود بھی بڑے بڑے نوابوں کی طرح رہا جیا —— سوچو بچپن سے ایسا تھا، بڑا ہو کر کیا نہ بنتا کہ بچپن کی عادتیں ہی تو بڑے ہو کر پختہ اور راسخ بنتی ہیں۔

حویلی کا نوکر خانہ محض نام کا ہی نوکر خانہ تھا۔ اچھے اچھوں سے اعلیٰ رہائش مصیبت کے ماروں کو نصیب ہو گئی۔ دل میں ایک وسوسہ ضرور تھا کہ اللہ جانے اس عنایت اور بخشش کا نواب صاحب کیا مول مانگیں —— مگر نواب صاحب بھلا کیا مانگتے وہ تو صرف دینے کے قائل تھے۔

احسانوں سے چور سکینہ بی کا بس نہ چلتا کہ اپنی جان کو نواب صاحب پر سے صدقے کر کے پھینک دیتی —— کسی نہ کسی طرح کچھ تو سرکار کے کام آسکوں، چھوٹے بچوں بچی کو اور کچھ نہیں تو پاؤں دبانے کو ہی سرکار کے کمرے میں بھیج دیتی۔

سرکار ایک دن مسکرا کر بولے: "اتنے اتنے بچے کیا پاؤں دبائیں گے۔ اایسا ج ہے تو بڑی کو بھیج دیا کر ——"

سکینہ بی نے ہول کر انہیں دیکھا —— یاد آگیا کہ ان ہی سرکار نے تو بیٹی کو خریدنے کے لئے توڑا بھر چاندی روپے بھجوائے تھے —— جب روپیوں سے بیٹی نہیں بچی تو اب —— اب خالی کمرے میں، بند دروازوں کے پیچھے یوں ہی اکیلے بیٹی کو کیسے بھیجے؟

سرکار نے اس کے چہرے پر لکھے ہوئے خیالات ایک ہی نظر میں پڑھ ڈالے۔

"ہم نا معلوم ہے تو کیا سوچ رئی۔ پر یہ بھی سوچ، ہم چاہتے تو کیا تیری بیٹی پر زور زبردستی کر کے اس کو اٹھوا کے نہیں منگا سکتے تھے! ہم کو روکنے والا کوئی ہے کیا؟"

"سرکار، آپ شادی اِچ کر لیو ——" مجبور سکینہ بی رو دینے والے لہجے میں بولی: "جوان بیٹی کی عزت کانچ کا برتن ہوتی —— ذرا دھکا لگی کی ٹوٹی۔"

"شادی؟" نواب صاحب کچھ غصے اور کچھ اچنبھے سے بولے "شادی کا مطلب ہوتا

پوری زندگی بھر کی ذمہ داری ـــــ پھر وارثاں پیدا ہو گئے تو جائداد کے جھگڑے الگ اُٹھتے۔ تو پاگل ہے کیا؟"

سکینہ ڈرتے ڈرتے بولی "پن سرکار وہ جب آپ کے شیروانی ہور اونچی ٹوپی والے نوکر آئے تھے تو اُنوں تو بولے تھے کی آپ .... وہ مصلحتاً چپ رہ گئی۔

نواب صاحب سچائی سے بولے "ہم بولے تھے منظور، مگر ہمارا مطلب وہ نئیں تھا ہم تو متعہ کرنے کا سوچے تھے۔"

"مت ـــــ مت ـــــ متعہ؟" سکینہ ہکلا ہکلا کر بولی "وہ کیا ہوتا سرکار۔"

سرکار نے صاف صاف کہہ دیا "ابھی جب ہم دو ہفتے کے واسطے جاگیر پہ گئے تھے کی نئیں تو بغیر عورت کے کیسا رہنا ـــــ بول کے ہم شادی کر لئے تھے وہاں ایک چھوکری سے۔ پھر واپس آنے لگے تو طلاخ دے کر آ گئے۔ مطلب یہ کہ تھوڑے دنوں کی شادی ـــــ تو ڈر مت۔ مگر ـــــ ہم طلاخ دیں گے تو مہر کے نام پو اتا پیسہ دے دیں گے کی تیری دو پشتیں چین سے کھا لینا۔ اتا دیں گے ـــــ بس ہمارے جی بھرنے پہ ہے کہ ہم کب طلاخ دیتے۔ پر اتا ہور سن لے، ایسے ایسے تو کئی متعہ ہم کرے، پر جہاں کسی نیچ کمینی ذات سے وارث پیدا ہونے کے امکان ہم نا نظر آئے ہم اپنے حکیم جی سے کوئی بھی گرم دوا کھلا دیتے کی گندے خون کا وارث ہم نا نئیں ہوتا۔"

"یہ سب حرام ہے سرکار ـــــ یہ کام حرام ہے۔" سکینہ کا رواں رواں چلا رہا تھا مگر سکینہ میں 'جی ہو' یا 'جی نئیں' کہنے کی سکت موتی تب نا ـــــ وہ تو ہونقوں کی طرح بس منہ کھولے بیٹھی کی بیٹھی تھی اور نواب صاحب فتوے پہ فتوے صادر کئے جا رہے تھے۔ "ہم عقد خوانی کر کے یا خانہ بیاہتا بی بی تو بس ایک ہی رکھے ہیں، جو بڑی پاشا کے نام سے مشہور رہیں ـــــ ویسے ہم نے دنیا ہی دیکھے ہیں بس ـــــ اس واسطے اب یہ جتنے ہی غریب غربا پوٹیاں، خواصاں ہمارے ساتھ رہتے ہم سب کو باری باری متعہ کرتے رہتے ہور طلاخ دیتے رہتے ـــــ آخر

غریبوں کا پیٹ تو پلنا ہی چاہیئے نا۔ ہم نہیں دیں گے تو ان لوگاں کا کیا ہوئیں گا؟"

یہ تو اس جھٹ پٹے کی بات تھی جس میں نواب صاحب نے چھت کی اونچائی پر سے ملگجے اندھیرے میں دُور نیچے چاند چمکتا دیکھا تھا۔ وہ دُوری اور یہ قربت!

آج انہیں یہ پتہ چلا کہ اُجالا کیا چیز تھی۔ اونہہ بال تو ان کم بخت غریب حیدرآباد عورتوں کو اللہ تعالےٰ نے جی کھول کر دئے تھے۔ اس کی کوئی بات نہیں۔ لیکن رنگ؟ کیا رنگ تھا! چاندی کو گھول کر جیسے اس کے جسم میں، رگ رگ میں دوڑایا گیا تھا۔ پھر آنکھیں تھیں، شراب وراب سب بے کار چیز ہے۔ یہ آنکھیں تو صرف اس لئے بنی تھیں کہ جن پر اٹھیں انہیں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیں۔ قد و قامت تو جو تھا وہ سامنے ہی تھا —— عربی شاعری میں عورت کے حسُن کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ عورت کے برہنہ جسم پر اگر ایک چادر سر پر سے ڈال دی جائے تو وہ چادر صرف دو جگہ سے جسم کو مس کرے —— ایک سینے پر سے دوسرے کولہوں پر —— باقی چادر یوں ہی جسم کے لمس کو ترستی رہے۔ اُجالا ایسے ہی جسم کی مالک تھی جو چادروں کو ترساتا ہے —— دو صبیح رخساروں سے سجے ہوئے وہ قاتل ہونٹ، جو اُجالا کا سب سے بڑا سرمایہ تھے۔ وہ ہونٹ جو ایک ایسی چُپ چاپ کٹیلی کٹیلی اور ہلکی سی طنزیہ مُسکراہٹ سے بھکے اور دہکے ہوئے تھے کہ نواب صاحب اپنے آپ کو بچا ہی نہ سکے۔

سب سے زیادہ حیرت تو نواب صاحب کو اس بات پر تھی کہ انہیں حکیم صاحب کی مطلق کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ جو بجائے خود ہیروں، موتیوں، سونے چاندی اور جواہرات کی کشش تھی، اس کے ہوتے ہوئے کسی معجون کی کیا ضرورت تھی۔

کیسے کیسے لمحے اس نے نواب صاحب کو عطا کئے کہ اپنی ساری پچھلی زندگی انہیں بے کار، بے رس اور برباد نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک دن انہیں جنت

میں گزرا ہوا معلوم ہوتا ــــ یہ سب تو تھا، لیکن اُجالا نے کبھی ان سے بات نہیں کی۔ ہر چند کہ وہ اس کی کمی محسوس کبھی نہیں کرتے تھے، لیکن پھر بھی دل چاہتا ضرور تھا کہ یہ دو آتشہ شراب، یہ قیامت، یہ فتنہ کچھ جادو اپنے دہن ولب سے بھی جگائے۔ کبھی کبھی بات پر بس وہ ہلکی سی چھپتی ہوئی سی مُسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیتی۔ بس گردن کی ایک ــــ ہلکی سی جنبش اس کی ہر بات کا جواب دے دیتی۔

"تمہیں ہمارے ساتھ خوش ہے نا، اُجالا؟"

جواب میں وہ طنزیہ، ہلکی سی، قاتل سی مُسکراہٹ اور بس!

"تمہارا کوئی چیز یوجی چاہتا؟ ویسے تو ہم اِج تم کو سب دے ڈالے۔ پھر بھی کچھ ہونا؟"

گردن کی ایک جنبش سے وہ "نہیں" کا اظہار کر دیتی۔

"تم بات کیوں نہیں کرتے اُجالا ــــ تمہیں اتنے خوب صورت ہے۔ تمہاری آواز بھی بہوت ہی بہوت اچھی ہوئیں گی ــــ کبھی تو بولا چالا کرو۔"

وہی مُسکراہٹ، کچھ قاتل، کچھ بھولی، کچھ کٹیلی، کچھ طنز میں ڈوبی ــــ مگر ہلکی سی!

نواب صاحب کی محفلیں تھیں تو اپنی مثال آپ ہوتیں ــــ ناچ گانے راگ رنگ، شباب و شراب کی محفلیں ــــ وہ بڑے دل والے تھے۔ ایسی محفلوں میں اگر ان کی متعہ کی ہوئی کوئی کنیز کسی دوست نواب کو جی جان سے پسند آجاتی تو وہ اسے جھٹ طلاق دے کر دوست کو تحفے میں دے دیتے۔ یہ ان کی سخی اور دل والے ہونے کی چھوٹی سی مثال تھی ــــ خود ان کے نواب دوستوں میں بھی یہی چلتا تھا، لیکن خود نواب زین یار جنگ نے کبھی کسی کا ایسا تحفہ قبول نہیں کیا کہ وہ بنے ہی اس لئے تھے کہ لوگوں کو دیا کریں ــــ لینے کا سوال ان کے یہاں اُٹھتا ہی نہ تھا۔

اس رات ایسی ہی ایک ہوش و حواس گم کر دینے والی محفل سجی ہوئی تھی ——— گرما گرم کبابوں کے طشت آ رہے تھے ——— سنہری، نقرئی، بلوریں جاموں میں، جن کے قبضے اور پٹھاوے سونے اور چاندی کے بنے ہوئے تھے، شراب پیش کی جا رہی تھی کہ نواب صاحب کے خاص حکم پر سُرخ زرتار لباس میں ملبوس اُجالا، سُرخ شراب کا چھلکتا ہوا بلوریں جام بن کر محفل میں داخل ہوئی ——— جس نے دیکھا، دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُوپر کی سانس اُوپر ——— نیچے کی نیچے۔

نواب صاحب فخر سے سب کو دیکھ رہے تھے ——— وہ اس وقت دُگنے نشے میں تھے۔ ایک شراب کا نشہ اور ایک ایسی بے مثال حسینہ کے احساسِ ملکیت کا نشہ تھا، جس کا کوئی ثانی ہی نہ تھا ——— وہ فخر سے ایک ایک کو دیکھ رہے تھے، جواب دھیرے دھیرے ہوش میں آ رہے تھے۔

"اِس کو بولتے جمال"۔ کوئی دل تھام کر بولے :

"ہور اس کو بولتے چال"۔

"جنّت کے حوروں کا ذکر بہوت سُنے۔ آج دُنیا میں اِچ دیکھ لئے"۔

"اب نواب صاحب کو دوزخ بھی ملی تو کیا غم۔ وہ تو یہیں اِچ جنّت کے مزے دیکھ ڈالے۔ لے ڈالے"۔

"مگر حضت، آپ یہ لاقیمت ہیرا کتّے میں خریدے؟"

نواب صاحب نے فخر سے سب کو دیکھا۔ جانے وہ کیا کہنے والے تھے کہ زندگی میں پہلی بار ——— اُن کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی میں پہلی بار اُجالا کی بانسری کی طرح بج اُٹھنے والی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی ——— جو سوال پوچھنے والے نواب صاحب سے مخاطب ہو کر طنزیہ لہجے میں کہہ رہی تھی :

"آپ لوگاں تو بس یہی جانتے کہ نواب زین یار جنگ بہوت بڑے نواب ہیں ———

بہوت بڑے دِل والے۔ بہوت سخی دیوال۔ بس دیتے رہتے مگر لیتے نئیں ــــ مگر اس حیدر آباد کی۔ ایک چھوٹے سے غریب گھرانے کی یہ غریب بچی بھی کچھ کم سخی نئیں ہے ــــ میں آپ لوگاں کو بتاؤں۔ زندگی بھر کسی سے کچھ نئیں لینے والا میرے سے بھیک لیا سو میں اپنے حسن کی زکوٰۃ نکالی تو بھکاریوں اور فقیروں کی قطار میں سب سے آگے جو فقیر جھولی پھیلائے کھڑا اتھا وہ یہی اچ آپ کے نواب زین یار جنگ تھے ــــ میں تو سُنی تھی کہ انوں ایسے دل والے ہیں کی کسی کا کوئی تحفہ تک نہیں لیتے، بس دیتے اچ رہتے ــــ پھر میں پوچھتیوں کی انوں میری خوب صورتی کی "زکوٰۃ" کیسا قبول کرلئے؟ ان کی کیا اوقات تھی کہ میری کو خریدتے۔ میں خود انوں کو بھکاری بنادی۔۔۔"

وہ جو ہر لمحہ اس کی آواز سُننے کو ترستے تھے۔ آج اسی کی آواز سُن تو لی، لیکن جیسے کانوں میں ہر دھات پگھلا پگھلا کر ڈال دی گئی کہ پھر اس کے بعد کچھ نہ سن سکے ــــ شراب کا جام ان کے ہاتھ سے چھوٹ گرا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی لہراتے ہوئے پھر کبھی نہ اٹھنے کے لئے زمین پر آرہے۔

زمین

"**ایو ماں**، اُجاڑ و خت کاں سے کاں پہنچ گیا۔ ہور کا ماں دیکھو تو کتے پڑے"۔

ایسے ہنگامے میں انا بی کی آواز کون سننے چلا تھا، جب ڈھول اور شہنائیاں اپنے عروج پر تھیں اور دیگچوں کی مسلسل کھڑکھڑاہٹ اور باورچیوں کی مسلسل بڑبڑاہٹ سے مردانہ زنانہ ایک ساتھ سراسیمہ تھا۔

برات کو دُلہن کی حویلی کے لئے ٹھیک سات بجے، بعدِ مغرب روانہ ہونا تھا، اور یہاں تو ابھی تک کسی چیز کا جوڑ جماؤ نہ تھا —— بڑی پاشا ڈھیر ساری کنیزوں، خواصوں، خادماؤں اور پالکڑیوں کی فوج لئے بہ نفسِ نفیس سارے انتظامات کراتی پھر رہی تھیں، لیکن ایسا لگتا تھا کہ آج کوئی بھی کام وقت پر ہونے والا نہیں۔ دُلہن کے ناشتے کے لئے نہ ابھی "شب دیگ" چڑھی تھی، نہ شیرمالوں کے لئے میدہ باورچیوں کو بھجوایا گیا تھا۔ انا بی کے اوسان اُڑے ہوئے تھے پچھلی رات، رات بھر رت جگا ہوا تھا۔ ڈھیروں تلن اور خاص طور سے میوے بھری پوریاں تیار کی گئی تھیں، کیوں کہ برات کے ساتھ اکیس خوان جانے تھے —— وہ سب کچھ تو تیار تھا۔

لیکن اتابی جو اپنے پُرانے پن، بڑھاپے اور رو بدلے کی وجہ سے پورے زنان خانے کی مالکن تھیں۔ خاص طور پر اس لئے پریشان تھیں کہ برات جب نکاح خوانی کے بعد دلہن کو آدھی رات کو لے کر واپس آئے گی تو پھر صبح ہونے میں دیر ہی کتنی باقی رہ جاتی ہے، اور اس وقت ناشتے کا کیا ہوگا؟

ایک دم انھوں نے ماتھا پیٹ لیا ـــــ اُجاڑ مٹی پڑے کو جاؤ میری یاد پر،" گھوڑے کا "خاصہ" تو انھوں نے اب تک بھجوایا ہی نہیں تھا!

"اَگے او رجب خان!" انھوں نے زور سے سائیس کو آواز دی: "کاں مر گئے؟ وہ تسلے میں اُبلے ہوئے بادام، گُڑ، بِلے چنے، ہور میدے کے لڈے رکھے وئے ہیں، اُٹھا کو لے جاؤ، ہور گھوڑے کو جلدی سے کھلادیو، نئیں تو چھوٹے پاشا تماشا کھڑا کرلے کو بیٹھیں گے ـــــ"

بات پوری کر کے انھوں نے سر اوپر اٹھایا تو دھڑ سے ان کا کلیجہ ہل گیا ـــــ سامنے ہی چھوٹے پاشا کھڑے تھے۔ ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ مُسکرا کر بولے "ارے اتابی، اب ہم کو اتا برا بھی مت سمجھو کی اپنی شادی کے دِن بھی ہم ایسے تماشے کھڑے کر لینے بیٹھیں گے۔" پھر وہ مُسکرا کر رجب خان سے مخاطب ہوئے ـــــ "ارے رجب خان، جلدی سے ذرا رُستم کو کھلا پلا کر فارغ کر دیو ـــــ برات چلنے سے پہلے ہم ذرا ایک پھیرا لے کر آئیں گے۔ اس کی چال کا اندازہ تو کرلے دیو آج۔" وہ ہنسے۔ ایسا نہ ہو کی سُسرال جا کو اڑیل پن کرنے کو بیٹھ جائے۔"

"نئیں سرکار، اُنے بہوت تابع دار جنور ہے۔ وہ آپ سے کیا اڑیل پن کرے گا۔"

"پھر وہی جنور؟" چھوٹے پاشا ذرا چڑے گئے۔ "رجب خان، ہم تم کو کِتّی دفعہ بولے کی ہمارے گھوڑے کو جنور مت بولا کرو۔ اُنے تم جیسے انسانوں سے زیادہ خیالِ خدر ہے۔"

رجب خان نے سر جھکا لیا۔ "ہو سرکار سچی بات بولے آپ۔" اور وہ چاندی کا تسلہ اٹھائے باہر کی طرف لپک گیا۔

سفید براق، شان دار اور خوب صورت رستم اپنے مالک کو دیکھ کر سُم پٹخنے لگا، جیسے سواری کی دعوت دے رہا ہو۔ چھوٹے پاشا نے اس کی پیٹھ تھپ تھپائی۔

"چھوٹے پاشا جلدی پلٹ کو آنا ماں۔ ابھی گھوڑے کو پورے ساز سے سجانے کا ہے۔" انا بی چھوٹے پاشا کو گھوڑے پر چڑھتے دیکھ کر پیچھے سے نرم آواز میں بولیں:

"ہم جلدی اچ آجائیں گے، انا بی، پر خدا کے واسطے امی حضور پوچھیں گے تو آپ یہ مت بولنا کی ہم سیر کو چلے گئے۔"

"نئیں ماں، میں نئیں بولنے کی ——— مگر جلدی اچ آنا۔ ایسے شادی کے دن بھی کوئی سیر کو جاتا کیا۔" وہ پیار سے بولیں۔

ایک ہی ایڑ لگاتے ہی گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا ——— اوائل اپریل کے دن تھے، شام کا سہانا وقت۔ پیاری پیاری ہوا چل رہی تھی۔ نہ موسم کا تقاضا تھا، نہ ہوا میں آثار کہ بارش ہوگی۔ لیکن پتہ نہیں کہاں سے ذرا سی دیر میں بادل گھر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بوندیں ٹپاٹپ ٹپاپٹ برسنے لگیں۔

"کم بخت یہ کون سی مصیبت آپڑی۔" چھوٹے پاشا نے آسمان کی طرف دیکھ کر سوچا، مگر بارش کے چند قطرے ان کے جوان اور تمتماتے ہوئے چہرے پر پڑے تو وہ خوش ہو اٹھے۔

"ہور برسو ——— ہور برسو!" انہوں نے بشاشت سے بادلوں کو سنایا ——— بادل بھی گویا حکم ہی کے منتظر تھے۔ وہ زور دار بارش شروع ہوئی ہے کہ توبہ ہی بھلی ——— گھوڑا اس وقت تک شاہ گنج کے چوک سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ باغ شاہی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

آگے بڑھتے تو گھوڑے کی ناراضگی کا خطرہ تھا اور پیچھے جانے کو ان کا اپنا جی نہیں چاہ رہا تھا ایسے موسم میں پاگل ہے وہ جو حویلی میں گھس کر بیٹھے ـــــ سامنے ہی خان زادوں کے گھر تھے۔ خان زادے وہ نوکر تھے جو پشتوں سے حویلی کی چاکری کرتے چلے آرہے تھے۔ موجودہ خان بوڑھے ہو جاتے تو ان کی اولاد کو وہی نوکری سونپ دی جاتی۔ چار مینار سے آگے کوٹلہ عالی جاہ کے برابر میں جو عمارتیں تھیں وہ سب ان ہی خان زادوں کے گھروں پر مشتمل تھیں اور حسام الدولہ کی جاگیر تھیں، یہ سب خان زادے ان ہی کی حویلی پر گھر باہر کے کام دیکھتے اور اپنے خاندان کے ساتھ ان گھروں میں رہتے۔ رجب خان بھی خان زادہ تھا اور مدتوں سے اس کے بڑے ڈیوڑھی میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے آتے تھے۔

چھوٹے پاشا نے گھوڑے کو موڑا اور سامنے کے گھر کے پاس روک لیا۔

سامنے اس گھر کا کھلا ہوا حصّہ تھا، اسی سے لگا ہوا چھوٹا سا سائبان، اور اندر زنانہ حصّہ۔ چھوٹے پاشا نے کھلے ہوئے حصّے میں پہنچ کر گھوڑے کو سائبان میں کھڑا کر دیا

"ارے اندر کوئی ہے؟" وہ باہر سے چلّائے۔

"ابھی آتیوں" ایک باریک سی نسوانی آواز آئی "الگنی پو پڑے سارے کپڑے بھیگ رئیں۔ ابھی سمیٹ کو آتیوں"

اور جب وہ کپڑے سمیٹنے والی باہر آئی اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں اور بھیگے ہوئے جسم کے ساتھ چھوٹے پاشا سے مخاطب ہو کر بولی "اب بولو کیا ہے؟ کائے کو اتا چلّائے رئے تھے" تو چھوٹے پاشا جو اب تک اپنے ہوش و حواس میں تھے، ایک دم مُڑتے ہی حواس سے بیگانہ ہو گئے۔ اور وہ ـــــ وہ خود بھی ڈر سی گئی۔ اس نے اپنے روایتی انداز اور لہجے میں آنے والے کو مخاطب کیا تھا۔ لیکن صورت دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ اس کا مخاطب کوئی معمولی شخصیت نہیں۔ اپنے اونچے پورے قد شہابی رنگت اور مردانہ وجاہت کے ساتھ چھوٹے پاشا اس طرح تنے کھڑے تھے کہ سامنے والا دیکھ کر مسحور سا ہو کر

رہ جائے ـــــ پچھلی کئی راتوں کی بیداری ان کی مخمور اور گلابی آنکھوں سے جھلک رہی تھی پورے جسم پر اُبٹن اور ہلدی کی پانچ دن کی مسلسل مالش سے سونا سا پھٹا پڑ رہا تھا ـــــ ہاتھوں کی اُنگلیوں میں ہیرے اور پنے کی انگوٹھیاں ان کی امارت کی تشہیر کر رہی تھیں ـــــ وہ سہم کر بولی "آپ ؟ آپ !"

"ہو ـــ ہم" چھوٹے پاشا مسکرا کر بولے۔ پھر اُس کی سہمی ہوئی نگاہوں کو اپنی اُنگوٹھیوں پر مرکوز دیکھ کر کہنے لگے "اپنے وخت کے راجہ، مگر اس وخت تمہارے در کے بھکاری"

"نکّو ـــ نکّو" وہ مزید گھبرا کر بولی : آپ کائے کو خود کو بھکاری بولتے ـــــ بھکاری تو ہم لوگاں۔ آپ تو آسمان ـــــ زمین بولے تو ہم"

چھوٹے پاشا نے بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کی نیت سے کہا "زمین کون آسمان کون، یہ تو بعد میں پتہ چلیں گا، مگر ہم ناں او چھوکری اندر چلنے کا تو بولو"

اس نے ہڑبڑا کر کہا "آئیے ـــــ آئیے ناپاشا۔ آپ کا اِچ گھر ہے" اُس نے ان کے اندر داخل ہونے کے لئے راستہ سا بنا دیا۔ جب چھوٹے پاشا اندر داخل ہوتے وقت اس کے ذرا قریب سے گزرے تو انہیں آنچ کا سا احساس ہوا اُنہوں نے چونک کر اسے دیکھا ـــــ شراب کا بھرپور پیالہ!" انہوں نے اپنی سرکش اور مونہہ زور توجہ کو بھٹکانے کے لئے گھر کے در و دیوار پر ایسی ہی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی ـــــ عام، غریب سے حیدرآبادیوں کی طرح کا گھر تھا۔ کوئی خاص بات تہیں۔ کوئی نئی چیز نہیں۔ ان ہی کے دئے ہوئے ان ہی کے بخشے ہوئے مخصوص گھر تھے، جو گھر کے نام پر تہمت تھے۔

"اس گھر میں تم اکیلی اِچ ہو؟"

"نئیں تو" وہ جلدی سے بولے بابا بھی میرے سنگات رہتے، پن آج وہ جلدی اِچ کام پو چلے گئے، بڑے پاشا کے صاحب زادے کی شادی ہے ناآج، اس واسطے"

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا —— رجب خان کی بیٹی ——؟ وہ عجیب سے خوشی بھرے لہجے میں ہاتھ ہلا ہلا کر سنائے جا رہی تھی —— آج گھوڑے کو سجانا ہے نا بابا —— بہوت دیر لگیں گی۔ گھوڑے کا پورا ساز زیور چاندی کا ہے معلوم؟ ہور ایسی شادی ہورئی کہ پوچھو مت آپ —— بابا میرے کو بھی لے جائیں گے بولے۔ مغرب کے بعد میرے کو لینے آئیں گے۔" وہ ایک دم مڑی اور پلنگ پر پڑے ہوئے ایک غریبانہ سے جوڑے کو اٹھاتے ہوئے بولی "میں اپنے کپڑے بھی نکال کو رکھ لی ہوں۔" وہ معصوم سی ہنسی ہنسی اور اس کے دانتوں کی جگمگاہٹ سے پورے کمرے میں چاندنی سی پھیل گئی۔

اب چھوٹے پاشا کچھ نہیں بول رہے تھے۔ صرف ان کی آنکھیں بول رہی تھیں۔

ان آنکھوں کی بے پناہ یورش سے وہ گھبرا سی گئی اور جیسے نجات پانے کے لئے بولی:

"آپ تو پورے بھیگ گئے پاشا —— چائے لے کو آؤں، ذرا تو بھی گرمی آجائیں گی۔"

"نہیں —— گرمی ویسے اِج بہوت ہے ——" پھر انہوں نے بغیر کسی تردد کے آگے بڑھ کر کمرے کے دونوں پٹ بھیڑ کر اندر سے کنڈی لگالی۔

"پاشا آپ بولے نا گرمی ہورئی، پھر دروازہ کائے کو لگالئے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔ یہ سوال کرتے وقت وہ اتنی معصوم ہو گئی تھی کہ اس کے بچاؤ کی ہر صورت اس کے ذہن سے مٹتی چلی گئی۔ گیلے کپڑوں میں لپٹا ہوا، کسا ہوا ایک گرم اور اَن چھوتا جسم۔ سُرخ و سفید رنگت، چھوٹی سی اونچی ناک، گھنے سیاہ گھنے بال، جن کی کچھ لٹیں بھیگ کر گورے گورے چمک دار گالوں سے لپٹ گئی تھیں، اور ان سب سے بڑھ کر وہ ہونٹ، جو ہونٹ نہیں تھے، مجسّم دعوت تھے، جو پتلے اور تراشیدہ ہوتے تو گناہ پر اس طرح نہ اکساتے، وہ ہونٹ جو ابھرے ابھرے سے تھے اور یوں گلابی تھے اور لبریز تھے جیسے اسی لئے بنائے گئے تھے کہ ایمان کو بہکاتے پھریں —— اور سب سے بڑھ کر باہر بارش کی ٹپاٹپ!

انہوں نے اسے باہوں میں کس لیا، یوں کہ اس کا دم گھٹنے لگا —— گردن، گال،

آنکھیں، ناک، ہونٹ —— چہرے کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں چھوٹے نواب کے بوسوں کی بارش نہ ہو رہی ہو۔ پھر ان کے ہاتھ اس کے پاکیزہ چہرے کو چھونے لگے —— "نکو پاشا نکو" کی صدا چھوٹے پاشا کے لئے بے معنی تھی، کیوں کہ ان کی جوانی اس ایک صدا کی عادی ہو چکی تھی، جسے وہ رات کے اندھیروں میں سنتے اور صبح کے اجالوں کے ساتھ بھول جاتے۔

"نکو پاشا نکو" کی صدا کے ساتھ چھوٹے پاشا کے ہونٹوں سے ہوتا ہوا ایک نمکین ذائقہ بھی ان کی زبان تک پہنچا —— شاید وہ آنسو تھے۔ مگر وہ تو پاگل بنے ہوئے تھے اس کا احتجاج، اس کی فریاد، اس کی بچاؤ کی کوششیں انہیں اور بھی بے قابو کر گئیں۔ کیوں کہ یہ ساری باتیں ان کے لئے آئے دن کا معمول بن کر رہ گئی تھیں

"نکو پاشا —— میں مر جاؤں گی۔ میرے کو تباہ مت کرو۔"

انہوں نے بے دردی سے اس کا گریبان کھینچا اور چرّ سے کرتا پھٹ گیا، اور مصری سے تراشا ہوا ایک بت سا ان کے سامنے عریاں ہو گیا۔ انہوں نے بے قابو ہو کر اسے اپنی مضبوط باہوں میں اٹھایا اور ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر لٹا دیا۔

باہر گھوڑا بُری طرح ہنہنا رہا تھا —— اندر وہ لڑکی بُری طرح روئے جا رہی تھی —— اس بُری طرح کہ چھوٹے پاشا کے ہوش اڑ گئے۔ ایسی عجیب مصیبت سے انہیں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا —— ندی چڑھ کر اتر جاتی ہے تو سب کچھ پُرسکون ہو جاتا ہے پہلے تو سب ہی دھاندل مچاتی ہیں، مگر بعد میں مطمئن ہو کر حالات سے سمجھوتا کر ہی لیتی ہیں۔ یہ تو خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ برابر ہچکیاں لے لے کر روئے جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ گردان —— "اب کیا ہوئیں گا —— میں کیا کروں گی میرے مولیٰ! —— میرے کو دنیا سے ہی اٹھا لے میرے مولیٰ!"

انہیں اس پر غصہ بالکل نہیں آیا ــــ پتہ نہیں کیوں رحم ہی آ رہا تھا ــــ ذرا نرمی سے بولے "کیوں خواہ مخواہ اتی چھوٹی عمر میں مرنے کی دعا مانگ رئی ہے۔"

ایک دم وہ تنتنا کر اٹھی ــــ "مرنے کی دعا کائے کو مانگ رئی ہوں؟ اب یہ جھوٹا دسترخوان کس کے آگے سجاؤں؟ اتی بے ایمانی سے اچھا ہے مر جاؤں۔"

انہوں نے دہل کر دیکھا ــــ شراب سے بھری کانچ کی بوتل ــــ نئیں ــــ میدے اور شہد سے گندھی ہوئی، بنائی ہوئی مورت! نئیں ــــ ان کا دماغ کسی بھی تشبیہ پر مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس بپھری ہوئی ناری کو کیسے قابو میں لائیں، کیسے اسے دلاسا دیں؟

"تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟"

"رجب خان۔" وہ ذرا حیرانی سے بولی۔

"کہاں کام کرتے اُنوں؟"

"بڑے پاشا کے یہاں۔" وہ مزید حیرت سے بولی۔

"بڑے پاشا کا نام؟"

"میرے کو نئیں معلوم۔"

"ہور چھوٹے پاشا کا؟"

"وہ بھی میرے کو نئیں معلوم۔"

انہوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور سکون بھرا سانس لیا ــــ وہ پھر ہچکیاں لینے لگی تھی اور اپنے پھٹے ہوئے کپڑے اٹھا اٹھا کر جسم چھپا رہی تھی۔ اسے پھر اپنی بے عزتی، بے کسی اور تباہی یاد آ گئی تھی اور وہ کہہ رہی تھی:

"بابا کے آنے سے پہلے میں باؤلی میں گر کر جان دے دیوں گی، ہور یاد رکھنا یہ خونِ ناحق تمہاری گردن پہ ہوئیں گا۔"

"ہم تم سے شادی کئے لیتے ہیں ــــ بس؟"

اس نے چونک کر اُسے دیکھا —— پھر لپک کر قریب آئی۔ اپنے دہکتے ہوئے بدن اور بکھرے بالوں اور ایمان کو ڈگمگا دینے والے چہرے کو لئے —— اور قریب، پھر یقین نہ کرنے کے لہجے میں بولی "آپ سچّی بول رئے؟"

"کیوں؟ تم نا جھوٹ دِکھتا کیا؟"

"آپ اِتّے پیسے والے! اور ہم غریب لوگاں۔"

"اس سے کیا فرخ پڑتا؟ کیا غریب لوگاں انسان نئیں ہوتے؟"

"سچّی؟" وہ مارے خوشی کے پاگل سی ہو گئی "یہ بہوت ہی بہوت بڑا گناہ آپ کر ڈالے تھے، مگر میرے کو اللہ سے یخین ہے کی آپ میرے سے شادی کر ڈالیں گے تو اللہ میاں معاف کر دیں گے۔"

وہ اسے اپنے سے قریب کرتے ہوئے بولے "تم میرے کو پہلے سے کیوں نئیں بولے بی بی کی شادی کر لیو۔ اِتّا رونا دھونا کر کے ناحخ اپنی پھول ایسی جان کو تکلیف دئے اچھّا ہوا میرے کو خود ہی خیال آگیا۔" اور اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لئے انہوں نے اسے اور بھی زور سے لپٹا لیا۔

اس نے اپنے اطمینان کے لئے پوچھا: "پھر شادی کی بات چیت کے واسطے آپ اپنی امّی کو بابا کے پاس کب بھیجیں گے؟"

اُنھوں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "بس یہاں سے جاتے اِچ —— دیکھو اس وخت چھ بجے ہیں نا —— بس زیادہ سے زیادہ سات بجے تک۔"

"سچّی!" اس نے خوشی سے بے حال ہو کر اپنی باہوں میں اپنے جسم کو کس لیا۔

عقد خوانی کا وقت بعد مغرب سات بجے رکھا گیا تھا۔ بڑے کرّوفر اور تام جھام کے ساتھ باجے بجاتی، آتش بازیاں لٹاتی برات جب دُلہن والوں کے ہاں

پہنچی تو دولہا کو دیکھنے والے اُڑے پڑ رہے تھے۔ عورتیں چلمنوں میں سے جھانک جھانک کر ایک دوسری کو سنا رہی تھیں۔

"اے تو ماں کتنا خبصورت دُولہا ہے چہرے پر آنکھ نہیں ٹھہرتی۔"

"کیا نور اُترا ہے کی پوچھو نکو۔"

"ہزاروں دُولہے دیکھنے میں آئے، مگر ایسا دُولہا کم ہی دِکھا۔ کتنا شرمیلا ہے۔ آنکھ نیچے سے اُپر نئیں کر رہا۔"

"دیکھو ذرا کتے چھوکریاں، سالیاں اس کے آگے ٹھنڈا اُڑا ے کو کھڑیں، مگر آنکھ اُٹھا کو کسی کو دیکھتا تک نئیں۔"

باہر بڑے سارے شامیانے تلے گدی دار کرسیوں اور چاندنیاں بچھے گدیلوں پر مہمان بھرے بیٹھے تھے ــــ شہ نشین میں مسند پر دُولہا مولوی صاحب، وکیل صاحب ماموں اور قریبی رشتہ داروں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔

جب مولوی صاحب نے آیتیں پڑھ کر بعوض ایک لاکھ سکہ رائج الوقت، دولہا میاں سے پوچھا "کیوں میاں، آپ کو یہ عقد قبول ہے؟" تو دُولہا میاں نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا

"خبول ہے ــــ خبول ہے ــــ خبول ہے۔"

پاگل خانہ

دُولہا آتا بول کو میں خورمہ پکائی
ایو ماں چٹنی کے کھانے کے لوگاں

میراثنوں کے ساتھ حویلی کی لڑکیاں بھی ہنس ہنس کر چلّا چلّا کر گا رہی تھیں :

دُولہا آتا بول کو میں فرشاں بچھائی
ایو ماں ٹاٹوں پہ بیٹھنے کے لوگاں

"اگے تو بھی گانا گے" صنوبر نے پاس بیٹھی مٹر مٹر دیکھتی خدا بخشی کے ٹھوکا دیا۔

"میں؟" خدا بخشی نے ڈر کر کہا۔

"ہور نئیں تو کیا میں دیواروں کو بول رئی" صنوبر ہنسنے لگی۔ "شادی بیاہ ہو کچھ اِچ ہو تیرے موہنہ پو سدا محرم ہی برستے۔ اُجاڑ تیرے کو . . . ."

"اگے او صنوبر آواز ملانا گے" صنوبر کو باتوں میں مشغول دیکھ کر کوئل چلائی :

"ایکلی میں اِچ رہ گئی کیا گانے کو"

دُولہا آتا بول کو میں اشرفیاں لُٹائی
ایو ماں کو تلے کے پھننے کے لو گاں

صنوبر اور کوئل کی آوازیں میراثنوں کی آوازوں میں مِل گئیں۔ حویلی کی سب ہی لڑکیاں اس وقت ڈھول کی تھاپ پر آوازوں کے سرگم میں مست ہو رہی تھیں۔ بس ایک خُدا بخشی ہی پاگلوں کی طرح ایک ایک کا موہنہ دیکھے جارہی تھی ——— دوسری عام لڑکیوں کی طرح خوشی یا جوانی کی ترنگ کا کوئی تاثر اس کے چہرے پر نہ تھا، ایک حیرت ——— بے پناہ حیرت اور یاسیت اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

ایک دم لڑکیوں میں بھگدڑ مچی ——— "ایو دُولہا جلوے کے واسطے اندر آتا بول رئیں۔ چلو دولہے کو ستائیں گے۔"

کسی نے خُدا بخشی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا "اَگے اُٹھ نا ———"

بس اسی ایک لمحے سے خُدا بخشی ڈرتی تھی کہ کوئی اس سے اٹھنے کو کہے گا ——— لڑکیاں اٹھتی ہیں تو اپنے ساتھ قیامت اُٹھا دیتی ہیں ——— اس میں کالی پیلی، دُبلی پتلی، امیر غریب لڑکیوں کی کوئی قید نہیں۔ ہر لڑکی اپنی جگہ قیامتِ صغریٰ ہوتی ہے۔ چودہ پندرہ کا سِن گزر جانے کے بعد کوئی اَن دیکھی قوت ہر لڑکی کے کان میں کہہ دیتی ہے: "تُم ہی وہ شے ہو جس کے لئے آدم جنت بدر ہوئے تھے۔" اور دوسرا کوئی کہے نہ کہے آئینہ تو ہر لڑکی سے کہتا ہی ہے۔ اسی لئے ہر لڑکی اور عورت کو آئینہ اتنا پیارا ہوتا ہے کہ وہ سمجھتی ہے آئینہ کبھی جھوٹ نہیں کہتا۔

مگر خُدا بخشی آئینے کی اسی سچائی اور صاف گوئی سے لرزتی تھی ——— سترہ اٹھارہ سال کی بہاریں برساتی عمر میں کونے کونے چھپنے والی خُدا بخشی کھڑی ہونے سے ڈرتی تھی۔

صنوبر اور کوئل نے دونوں طرف سے ایک ایک ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ دو ڈھائی ہاتھ کی دُبلی پتلی پچکی پچکی سی جان، لڑکیوں اور عورتوں کے ریلے میں یونہی

بھونچکا سی کھڑی رہ گئی۔

"چل گے۔ سب سالیاں دُولہا کا جوتا چھپا لے رئیں۔ اپن بھی چلیں گے" صنوبر نے اسے زور سے دھکا مارا۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح یوں ہی کھڑی رہی۔

ایک دم کوئل براتیوں کے ہجوم میں ایک مانوس چہرے کو دیکھ کر اپنی جگہ بل کھا گئی ——

"اللہ دیکھ صنوبر —— اُنوں آج بھی حاضر ہوگئے میرے کو ستانے" اس نے جامہ دار کی مکھن نے رنگ کی شیروانی اور اطلس کا سل سلاتا چُست جامہ پہنے ہوئے ایک خوب رُو لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا: "کل دُولہا والوں کے ہاں میرا ہاتھ اِچ پکڑ لئے —— اچھا تو اچھا کوئی دیکھا نئیں۔ کیا بولے معلوم؟" غریبوں کو تڑپا کو کیا ملیں گا! اچھت پو آنے میں خالی چالیس سیڑھیاں تو چڑھنا پڑتا۔ میرے واسطے آتا بھی نئیں کر سکتی کیا؟" اور وہ اپنی بات پر خود ہی شرمانے لگی۔

"اگے چل" صنوبر ذرا غصے سے بولی "اپنے یہ گلابی لاڑاں چھوڑ۔ سارا حیدرآباد بس ایک تیرے پو اِچ مرتا جیسا —— ذرا گانا اچھا گالیتی تو نخرے اِچ بتا رئی"۔

کوئل مٹک کر بولی "ہور اچھا گاتی جب ہی تو بڑے پاشا کوئل نام رکھ دے، ہور اچھی لگتی جب ہی تو سارے مردوئے آگے پیچھے پھرتے"

صنوبر ذرا برہم ہو کر اسے لتاڑنے لگی "جیسی یہ کوئی بڑی اچھی اِچ بات تو ہے۔ دیکھ لینا ایک آدھ دن مرن مٹی ہو جائیں گی۔ کوئی بھی تِرے ایسے چالوں سے نداف روئی دُھنکتا جیسا ویسے تیرے کو دُھنک کے رکھ دیں گا ——

ہنس کر کوئل صنوبر کو انگوٹھا دکھاتے ہوئے بولی "اگے جس کے پاس دھنکوانے کو کچھ ہوئیں گا، اسی کو تو کوئی دُھنکیں گا؟ تم لوگاں کے پاس کچھ ہو بھی" وہ حرام زدگی سے ہنسی۔ "اگے اندھیرے اُجالے کوئی مردوا آکو دبائے تو اس کو پتہ اِچ چل کو نئیں دے کہ

اُنوں لڑکا ہے یا لڑکی ۔"

"نکل چھنال ۔" صنوبر اسے دھکا دے کر بولی : "شرم تو بیچ بزار میں بیچ کو کھا گئی ۔" پھر ذرا وہ نرمی سے خدا بخشی کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی ۔ "پورے حویلی میں اتّی بے شرم رانڈ کوئی نئیں ہوئیں گی ـــــــ چل جلدی سے ۔ اپن یہیں رہ گئے ۔ سالے لوگاں اُدھر دُولہے والوں میں پہنچ گئے ۔"

"میں نئیں آتی صنوبر ۔ تو چلے جا ـــــــ میں باورچی خانے میں جاتیوں ـــــــ ماما بی کو کام میں ہاتھ دیتی ۔ نانی حضرت تو سو گئے ۔"

صنوبر نے اس کی آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ لیا تھا ۔ پیار سے اپنے دوپٹے سے اُس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی "اگے کیتی پاگل ہے گے تو ۔ کتا روئیں گی ؟ روتے روتے مر جائیں گی کیا ؟ ہور پھر رونے دھونے ہور غم کرنے سے تو تیری صحت ہور بھی خراب ہوئیں گی ۔ ہور پھر تو تو بالکل بھی نئیں بڑھیں گی ۔"

خدا بخشی غم ناک سی ہنسی ہنس کر بولی "صنوبر میرے کو جھوٹے دلاسے دے کو مت بہلا ۔ میرا اب اٹھارواں سال بھی پورا ہونے کو آریا ۔ اب میں کیا بڑھوں گی ، ہور کیا میرا جسم بھریں گا ۔ جو دن بڑھنے کے تھے وہ تو ماراں کھاتے کھاتے سہم کو دب کو رہ گئے ۔ اب میں کیا ہوں ہور زندگی بھر کیا رہوں گی ، میرے کو معلوم ہے ۔" وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ، آنسو پونچھتی باورچی خانے کی طرف چلی گئی ۔

شادی کے ہنگامے ختم ہو گئے ۔ مہمانوں سے بھری حویلی خالی ہونے پر بھی بھری کی بھری ہی رہی کہ حویلی کے مکین ہی اتنے تھے کہ سدا بارات کا گمان ہوتا ۔ نوکر خانے میں نوکروں ، نوکرانیوں کی وہی ریل پیل ، وہی دن رات کی چہل پہل ۔ لیکن نوکر خانے کی ایک کوٹھری ایسی بھی تھی جہاں سے کبھی ہنسی کی آواز اُبھری نہ جوان بولوں کی کھنک سُنائی دی ۔

ایک ماں، ایک بیٹی اور ایک بیٹے پر مشتمل یہ خاندان خزاں کا پالا ہوا تھا۔ سُنتے ہیں، لوگوں کو گناہوں کی سزا ملتی ہے، مگر خاتون بی کو ان کی نیکی کی سزا مِل رہی تھی۔ اس حویلی کی موجودہ مالکن جب بیاہ کر دُلہن بن کر اس حویلی میں آئی تھیں تو حسبِ دستور لونڈیوں، خواصوں اور کنیزوں کا ایک پرے کا پرا ان کی خدمت پر مامور تھا۔ ان کی خِدمت گھریلو قسم کی خدمت تھی۔ یہی پاؤں دبوانا، سر میں تیل لگوانا، سر دُھلوانا، کھڑے دوپٹے رنگوانا، مسالے گوٹے ٹنکوانا، کھانے کے بعد ہل کر پانی بھی نہ پینے دینا، سلفچی بدھنے میں پانی لا کر وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ دُھلوانا ——— ایسے ہی چھوٹے موٹے کمی کام۔ ان کے دولہا میاں پہلے چھوٹے سرکار تھے، بعد میں بڑے سرکار بنے۔ ان کی خِدمت کے لئے بھی یہی لڑکیاں بالیاں، کنیزیں تھیں۔ اور وہ ان سے وہ "خدمت" بھی لے لیا کرتے تھے جو دُلہن بی بی نہیں لے سکتی تھیں مرد کے اختیارات زیادہ وسیع ہوتے ہیں نا! اور مرد اپنے اختیارات زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کا آرزومند بھی ہوتا ہے۔ اور مرد کی ایک فطرت یہ بھی ہے کہ ناقابلِ حصول شے پر زیادہ شدومد کے ساتھ لپکتا ہے، آسانی سے مل جانے والی چیز سے وہ مطمئن نہیں ہوتا ——— بازار سے قصاب کی دکان سے آنے والے گوشت سے پیٹ تو بھر جاتا ہے وہ طلب نہیں بھرتی جو اپنے ہاتھ سے شکار کر کے نوچ کر کھانے سے بھرتی ہے، دُلہن بی بی سے چوری چھپے اندھیرے اُجالے ہر خواص اور کنیز کو سرکار اِستعمال کر چکے تھے اِس میں کچھ تو خود کنیزوں کی اپنی مجبوریوں کو دخل تھا کہ مُٹھی بھی گرم ہو جاتی تھی، کچھ خود ہی پرلے درجے کی چھنالیں تھیں کہ ان کی بھی ایک مرد سے سیری نہ ہوتی، ان میں صرف خاتون بی ایسا ہیرا کا جھونکا تھی جو کبھی سرکار کے قریب سے ہو کر گزرا تک نہیں۔ اور اسی چیز نے انہیں گرما کر رکھ دیا۔ ہزار مرتبہ پانوں کے بہانے، شربت کے بہانے، کھانے کے بہانے اسے اپنے محل نما کمرے میں بلایا، لیکن وہ کبھی لمحے دو لمحے سے زیادہ رُکی نہیں، ——— وہ جوں جوں ان سے کتراتی گئی، سرکار کی بے قراری بڑھتی گئی۔ ایک عورت اپنے

مرد کو اس حد تک تو معاف کر بھی دیتی ہے کہ کسی لڑکی سے وقتی طور پر دل لگایا، بستر پر لٹایا پھر لڑکی کو بھی پھینک دیا۔ اور گندی چادر کو بھی پھینک دیا۔ مرد اور بستر کی اصل حق دار تو وہی ٹھیری ——— لیکن کوئی مرد کسی عورت کو ڈھول کی طرح گلے میں باندھ لے اور ساری کی تو لگالے تو یہاں عورت چیخ جاتی ہے۔ خاتون بی کا کترانا اور سرکار کا دم دینا بھوپاشا نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا، مگر غصہ انہیں اپنے مرد پر نہیں آیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ یہ اسی لئے مرا ہے ہیں کہ وہ انہیں قریب نہیں آنے دیتی ۔ ورنہ مرد بھی کبھی کسی ایک کا ہو کر رہا ہے، چنانچہ انہیں اپنے شوہر کی بجائے خود خاتون بی زہر لگنے لگی۔ محل کی روایتوں کو وہ بالائے طاق رکھ کر انہوں نے خود اپنے مونہہ سے ایک دن اس سے کہا "ہوری سرکار بلاتے تو تو بھاگ بھاگ کیوں جاتی ؟"

خاتون بی کچھ نہیں بولی ——— سر جھکائے کھڑی رہی۔ بھوپاشا پھر چپ ہو گئیں تو اس نے دھیرے سے کہا "میں ایسا دسترخوان نہیں بننا چاہتی پاشا جس پر جس کا جی چاہے آکر پیٹ بھر لے۔ میں ایک کے واسطے جیوں گی، اسی ایک کے واسطے مر بھی جاؤں گی ۔"

بھوپاشا کے خون میں اس زور کا ابال آیا کہ ان کا پورا جسم سرخ ہو گیا۔ مونہہ سے تو کچھ نہ بولیں لیکن غصہ کا وہ عالم تھا کہ بدن چٹخا جا رہا تھا۔

پھر دوسری رات بھوپاشا نے اپنا ایک ٹکا ٹکایا جوڑا نکال کر خاتون بی کو دیا دوسری کنیزوں سے کہہ کر اس کا سنگھار کرایا۔ جب دلہن کی طرح جگر مگر کرتا اس کا سنگھار کو دیے اٹھا تو انہوں نے اسے ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ پھر سرکار کو بلوایا۔ اس کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر سرکار کو اندر جانے کا اشارہ کر کے کہا: "جائیے دسترخوان بچھا ہے، پیٹ بھر کر کھائیے ۔"

اس دن کے بعد سے سرکار کے سر سے خاتون بی کا بھوت اتر گیا ——— اور

خاتون بی کے چہرے سے ہنسی اور تازگی اُتر گئی۔ سچے موتی کی چمک ایک بار ماند پڑ جائے تو پھر وہ چمک واپس نہیں آتی۔ اب خاتون بی سڑک پر لگا ہوا ایسا نل بن گئی جس سے جس کا جی چاہتا پیاس بُجھا لیتا ـــــ اور وہ کچھ مزاحمت بھی نہ کرتی۔ جو حادثہ ایک بار ہوا اگر سو بار بھی ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ نہ کبھی اس نے شادی کے بارے میں خود سوچا نہ اس کی شادی ہوئی۔ ایک ایک کر کے محل کی ساری کنیزوں باندیوں کی شادیاں ہو گئیں اور وہ اپنے ٹھکانے بیٹھ گئیں، یا تو اسی محل میں یا دوسروں کی حویلیوں محلوں میں ـــــ لیکن خاتون بی اسی حویلی میں اسی باورچی خانے میں رہی۔ اس درمیان نہ جانے کس کس کے کچے پکے ادھ مرے بچے پیدا کرتی رہی، جو کبھی ہفتہ بھر سے زیادہ نہ جئے۔ پھر چند برس بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھول جیسی نازک، دُبلی پتلی، مانو کانچ کی بنی ہو۔ گورا رنگ، سیاہ جھبّا جھوُل بال۔ دائی ماں نے پیار سے اسے جُھلا کر کہا "اُجاڑ ماری کے سارے بچے پیدا ہوتے جاتے مرتے جاتے ـــــ اب اس کا نام خُدا بخشی رکھ دیو کی بچ تو بھی جائے ـــــ" خُدا ہی بخش دے تو کون مارے۔ یوں خُدا بخشی کو خدا جانے خاتون بی کو بخش دیا۔ دو برس کی ہوئی تو سارے نوکر خانے کی دِل چسپی کا مرکز بن گئی ـــــ گُڑیا کی طرح اچھلتی پھرتی ـــــ ایسی ماں کی کوکھ میں رہی تھی جس کا ہر احساس جھُلستا رہا تھا۔ دائی ماں کو تو اس کے زندہ بچ رہنے پر ہی حیرت تھی ـــــ بڑھوتری کے بارے میں اُنھوں نے خاتون بی سے بار بار کہا تھا "آگے چولہے کا کھانا پکانے کا سارا سامان تو تیرے اِچ ہاتھاں میں رہتا۔ اس کو خوب کھلایا کر تو اچھے سے پنپے گی، نئیں تو کرُپ کو رہ جائیں گی"

لیکن خاتون بی جواب کچھ نہ دیتیں، صرف سنتی رہتیں ـــــ ویسے خلاؤں میں تکتے رہنا اس کا محبوب مشغلہ بن کر رہ گیا تھا۔ راتوں کو بھی وہ یوں ہی پڑی آسمان کو تکتی رہتی۔ ایسے میں کوئی بھی جنسی بھوک سے بلبلایا ہوا مرد، وہ حویلی کا نوکر ہوتا یا آقا اُسے ذرا بھی اشارہ کرتا تو وہ ایک معمول کی طرح اٹھ کر چلی آتی۔

"میں مرے بعد سیدھی جنت میں جاؤں گی۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا کتنا ثواب ہے۔ —— میں کتوں کی بھوک مٹاتی نا"، وہ اپنے آپ سے کئی بار بڑبڑائی۔

خدابخشی کے بعد پھر ایک بار وہ اور بھی ماں بنی۔ اب کے لڑکا ہوا۔ بیٹی کی طرح بیٹے پر بھی کسی اور کی ہی چھاپ پڑی تھی۔ ٹکسال میں سکے ڈھلتے ہی ہیں۔ کسی نے سونا انڈیلا کسی نے چاندی ڈالی، بہرحال سکے بن بن کر نکلتے رہتے ہیں، مگر یہ عجیب ٹکسال تھی، ہر سکہ مختلف! خاتون بی نہ مانجھے چڑھی نہ سہرے جلوے دیکھے، اور دلہن بھی بن گئی، اور ماں بھی۔ اپنی پاکیزگی لٹنے کا داغ ایسا لگا کہ وہ جیتے جی مُردے سے بدتر ہوگئی —— کسی کی کسی بات کا وہ جواب ہی نہ دیتی۔ بالکل پاگل کی طرح لگنے لگی تھی۔ ہانڈیاں جلا دیتی، روٹی کوئلے کا روپ ہو جاتی۔ تھک ہار کر دلہن پاشا نے اُسے بھی اپنی امی جان کی خدمت پر لگا دیا۔

دلہن پاشا اپنی امی جان کو میکے سے لے آئی تھیں، کیوں کہ وہ سدا بیمار رہتی تھیں اور دلہن پاشا ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بیٹے تو چار تھے، مگر بہوئیں کب کسی کی ہوئی ہیں۔ جب بھی یہ میکے جاتیں تو ماں کا بُرا حشر دیکھتیں کہ بہوئیں تو اپنے اپنے چونچلوں میں مست ہیں اور امی جان کے مونہہ پر سے مکھی اُڑاتے والا بھی کوئی نہیں۔ محل کی پالی پوٹیاں جب دیکھتیں کہ بہوئیں ہی ساس کا خیال نہیں رکھتیں تو وہ بھی بیٹھی رہتیں یا پھر اٹھ کر بھاگ جاتیں —— سرکار سے پوچھا تو وہ "نہ" کیسے کہہ دیتے۔ ایسی پیاری بیوی تھیں کہ جو دوسری لڑکیوں سے سج سجا کر شوہر کو خوش کرتی تھیں —— یوں اب امی جان یہیں رہتی تھیں، اور امی جان کی خدمت کے لئے کسی نہ کسی کو مامور کرنا ضروری تھا۔ سو پہلے بہو پاشا نے ننھی سی جان خدابخشی کو اس کام کے لئے چُنا جو اس وقت بمشکل پانچ چھ سال کی ہوگی۔ کھانے کھیلنے بھاگنے دوڑنے کی عمر میں خدابخشی بند کمرے میں دواؤں، معجونوں، اُگال دان اور بلغم کے ڈھیر میں دفن کر دی گئی۔ حویلی کے سب بچے شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بڑے باغ میں

کھیلتے، جھولے جھولتے اور خُدا بخشی امّی جان کے پاؤں دباتی یا مکھیاں اُڑاتی۔ چھوٹا بھائی اکبر رینگتے رینگتے بہن کے پاس آجاتا، کبھی پیشاب کر دیتا، کبھی پاخانہ، تو بیوپاشا دونوں کو چپل یا بید سے مارتیں کہ ہاتھ سے مارنے سے ہاتھ دُکھنے لگتے تھے۔

"اگے حرام زادی —— کھا کھا کے مُسٹنڈی ہورئی۔ ذرا بھائی کو نہیں سنبھال سکتی۔ اُنے یہاں آکو گندگی بکھیرتا، غلاظت پھیلے گی تو امّی جان کی صحت ہور خراب ہوئیں گی۔ ابھی اُنوں کو کتے خوشیاں دیکھنا ہے۔ نواسوں، نواسیوں کی شادیاں، ان کے بال بچوں کی خوشیاں دیکھنا ہے۔ تیرا کیا ہے رانڈ، کھیل سے اِچ فرصت نہیں ملتی۔ ہور کھیل سے فرصت ملی تو ڈھکو سنے کو بیٹھ جاتی مُردار۔ امّی جان کا سارا کھانا تو تو اِچ کھا جاتی۔ اُنوں کتے کم طاخت ہورئیں عور تو پھولتی جارئی"۔

ایسے موقعوں پر اپنی کھوئی کھوئی، ویران آنکھوں سے خاتون بی اپنی خدا بخشی کو دیکھتیں کہ سال پر سال گزرے جارہے ہیں اور پھولنا تو الگ رہا اس کا قد بھی جیسے ایک ہی جگہ پر آکر ٹھٹک گیا تھا۔

اکبر اور خدا بخشی میں زیادہ چھوٹائی بڑائی نہ تھی۔ وہ دو سال کی تھی تب ہی یہ پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن اکبر کئی برسوں تک تو صرف رینگتا ہی رہا، بڑھا ہی نہیں اور پھر جو بڑھنا شروع ہوا تو بہن سے بھی ہاتھ بھر لمبا نکل گیا۔ اس کے ذمّے باہر کے کام لگا دیے گئے۔ اب دوسرے مرد نوکروں کی طرح وہ بھی باہر مردوں والے نوکر خانے میں رہتا۔ بہرحال وہ تازہ ہوا کھاتا تھا، گھوڑوں کو صاف رکھنا، انہیں گھمانا پھرانا اس کے ہاتھ میں تھا۔ گھوڑ سواری کا موقع بھی اسے مل جاتا تھا۔ جلد ہی وہ اپنی عمر سے بلکہ اپنی بہن سے بھی بڑا نظر آنے لگا۔ اور خدا بخشی وہیں ٹھیر کر رہ گئی۔ اس کا دماغ بھی جیسے ٹھٹھر کر رہ گیا۔ ہوا یہ کہ اُن ہی دنوں امّی جان پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ وہ بالکل بے سروپا باتیں کرتی رہتیں اور اکیلی خدا بخشی ان کی ساری بکواس سُننے پر مجبور تھی۔ حویلی نوکروں چاکروں سے بھری

پڑی تھی۔ مگر سب کے ذمّے کام لگے ہوئے تھے ــــــ توشے خانے کی ذمہ داری اس کی موودی خانے کی نگرانی اس کی ــــــ یہ باغوں کی رکھوالی پہ، وہ جھاڑو لگوانے پر ــــ وہ باورچی خانے کی منتظم یہ مسالے پسوانے کی نگراں۔ بیسیوں نوکر تھے تو کام بھی بیسیوں تھے، اور سب کے کام بٹے ہوئے تھے۔ خدا بخشی کے نصیب میں تیمارداری لکھی گئی تھی ــــــ غلاظت کے پاٹ سمیٹنا، بلغم اور تھوک سے بھرے اُگال دان صاف کرنا۔ امنی کو نہلانا، کپڑے بدلوانا کنگھی کرنا، ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلانا ــــــ اور سب سے بڑھ کر ان کی بک بک سننا۔

جب تک خدا بخشی چھوٹی تھی۔ ممتا کی ماری ماں ہوش گم ہوتے بھی، بڑے کاموں میں اس کی مدد کو خود لپکی آتی تھی۔ امنی جان کو نہلانے میں مدد کر دیتی۔ کپڑے بدلوا دیتی، پاٹ صاف کر دیتی۔ البتہ دوسراہٹ کے لئے کہ امنی جان اکیلی نہ رہیں، دن بھر خدا بخشی کو ہی بیٹھنا پڑتا تھا۔ لیکن جب خدا بخشی پر سال پر سال گزرنے لگے، چاہے وہ قد و قامت میں نہ بڑھی لیکن عمر تو بڑھ ہی رہی تھی تو امنی جان تمام تر اسی کی ذمہ داری بن کر رہ گئیں۔ اب خاتون بی کے لئے خود اپنی جان سنبھالنا بھی دشوار تھا۔ وہ بس اپنی کوٹھری میں ہی پڑی رہتی۔

ان تمام برسوں میں چھوٹی چھوٹی بچیاں بچپن اور کم سنی کے حدود سے نکل کر جوانی کی رنگین سیڑھیاں تک پہنچ گئیں۔ جوانی ہر عورت کا حسین ترین سرمایہ ہوتی ہے اور جوانی کے دنوں کے بھی سات حسین ترین دن ہر لڑکی کا سب سے بیش بہا خزانہ ہوتے ہیں جب چھیڑ چھاڑ میں ایک دوسرے پر اور زیادہ تر جنسِ مخالف پر اپنی جادوگری کے تیر چلائے جاتے ہیں۔

جب کبھی امنی جان سو جاتیں اور خدا بخشی کو تھوڑا بہت وقت ملتا تو وہ لڑکیوں سہیلیوں میں جا کر بیٹھتی۔ نماز کا وقت ہو جانے پر ایک دوسری سے مذاق چلتے۔

"تو نے نماز پڑھ لی؟"

"کیوں، مہینہ بھر نماز آج پڑھتی رہوں گی کیا؟" کوئی شرما کر کہتی۔

اُدھر سے کوئی لڑکا جان بوجھ کر کہہ اٹھتا: "نماز کے وخت پر یہ کیا شور مچ رہا۔ تم

چھوکریاں نماز کو کاے کو ٹالتے":

لڑکیاں شرما کر کم، تن تن کر زیادہ ایک دوسرے کو ٹہو کے دیتیں۔

کوئی جواب دیتی "اجی تم ناکیا کرناجی۔ ہم کو اللہ میاں خود چھٹی دیتے"۔

لڑکے سر کھجاتے ایک دوسرے کو شریر نگاہوں سے دیکھتے، پھر ان کی نگاہیں لڑکیوں کے جسموں کو ٹٹولتیں، اور بات اُن کی سمجھ میں آجاتی۔

"یہ اچھی چھٹی ہے —— ہم کو نئیں ملتی ایسی چھٹی ——" اور لڑکیاں دوپٹوں میں مونہہ دبا دبا کر ہنستیں۔ دوپٹے جو جوانی کو چھپانے کے لئے کم اور دکھانے کے لئے زیادہ کام آتے۔

خدا بخشی پر یہ دور کبھی آیا ہی نہیں۔ اٹھارہ برس کی ہونے کو آئی، قد دو ڈھائی ہاتھ سے زیادہ نہ بڑھ سکا اور نماز قضا ہونے کی نوبت تو کبھی آئی ہی نہیں، لیکن دل میں جذبات اور احساسات اور سب سے بڑھ کر ارمان تو وہی تھے جو کسی بھی لڑکی کے ہو سکتے ہیں —— ارمانوں کی فصل بھی کیا فصل ہوتی ہے کہ اس پر کبھی خزاں آتی ہے نہ اسے پالا ہی مارتا ہے۔ سدا لہلہائے جاتی ہے، اور ان سب پر ستم یہ کہ سب مل کر بیٹھتیں تو دائی ماں کی باتیں قیامت ڈھاتیں، ہنسی مذاق، دل لگی میں وہ طاق تھیں۔ دنیا جہان کی فضول باتیں اُن کے مونہہ سے سن لو۔ جہاں کسی ماں نے کسی بیٹی کو دہائی دی "اگے اتا مت ٹھوس ٹھوس کے کھا۔ کدو کی کدو ہو جائے گی تو بر نئیں جڑیں گا —— تو دائی ماں بول اٹھتیں "اگے بڑھوتری کے دن ہیں گے۔ مت منع کرکھانے پینے کو۔ ہور کھائیں گی اچ نئیں تو جسم کیسا بھر کو اٹھیں گا —— ہور جو بھی عورت کا آنگ اچ نئیں بھرا وہ عورت اچ کیا —— دیکھنے میں تو موئے دو پاؤ پاؤ سیر کے گولے رہتے، پن یہی پاؤ پاؤ سیر کے گولے عورت کے واسطے کتے ضروری ہوتے۔ یہ نئیں ہوتے تو لڑکی لڑکی نئیں سجتی۔ اس سے اچ بچے پلتے۔ اس سے اچ مرد موئے خوش رہتے ....."

لڑکیاں دوپٹوں میں مونہہ چھپا چھپا کر ہنستیں۔ عمر والیاں کہتیں "اُجاڑ مٹی پڑے کو جاوَ جی، اپنے دائی ماں کی باتیں سُنئے؟ اُتنے اتنا خیال نہیں کرتے کہ سُننے والیوں میں چھوکریاں بھی بیٹھے ہیں۔"

خدا بخشی اپنے آپ میں سُکڑی سمٹی چھ سات سال کی بچی نظر آتی۔ کوئی اسے اتنی بھی اہمیت نہ دیتا کہ محض لڑکی ہی کہہ دیتا —— سب بچی ہی کہتے۔ آنے جانے والے اسے دیکھتے تو حیرت سے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ صورت اتنی پیاری تھی کہ نظر اٹھانے کو جی نہ چاہے لیکن جب تک وہ بیٹھی رہتی، اس کی خوب صورتی کا جادو قائم رہتا، جہاں کسی کام سے اٹھتی صاف لگتا کہ کچھ نہ کچھ ادھورا پن اس کے چلنے میں ضرور ہے۔ چھوٹے سے جسم پر اچانک وہ چہرہ کسی بڑی عمر کا معلوم ہونے لگتا، اور خود کو سب کی نگاہوں کا مرکز بنے دیکھ کر وہ اپنی چال چلنا بھی بھول جاتی۔

حویلی میں شادی بیاہ کی تقریبات لگی ہی رہتیں، مگر خدا بخشی ان سارے جھمیلوں سے اس قدر گھبراتی کہ کونے کھدروں میں چھپتی پھرتی۔ نانی حضرت سو جاتیں تو خواہ مخواہ چار چار ماماؤں کے ہوتے ہوئے باورچی خانے میں ہاتھ بٹانے کے لئے گھس پڑتی، لیکن دل کی جلن وہاں بھی اسے چین نہ لینے دیتی۔ ماں کے پاس جا کر بیٹھتی تو وہ اپنی ہی خیالی دُنیا میں مگن رہتی۔ نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی نہ بات کرتی۔ جوانی میں مردوں نے اسے بُری طرح نوچا کھسوٹا تھا کہ اس کے لاشعور میں مرد کا تصور ہی یہ تھا کہ وہ کسی بھی وقت صرف اپنے مطلب سے عورت کے پاس آتا ہے۔ اسی لئے اس کی کوٹھری کے پاس سے اگر کوئی مرد گزر بھی جاتا تو وہ فوراً اپنا کرتا اٹھا دیتی —— خدا بخشی بچہ نہ تھی، سمجھتی تھی کہ ماں ایسی حرکت کیوں کرتی ہے۔ وہ ماں کی اس حرکت سے لرز لرز اٹھتی تھی نانی حضرت کے پاس سے بار بار بھاگ کے آتی، اور ماں کی کوٹھری کا دروازہ بند کر دیتی کہ کوئی مرد سامنے سے گزرے بھی تو ماں اپنے ننگے ہوتے بے بس جسم کی نمائش نہ

لگا بیٹھے۔

خُدا بخشی سوچتی، اس زندگی کا فائدہ کیا ہے اور اللہ ایسے لوگوں کو پیدا ہی کیوں کرتا ہے۔ آج تک اپنی ــــــ اپنے بھائی اور ماں کی زندگیوں کا کوئی مقصد ہی اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا ــــــ ایسی زندگی سے موت کیا بُری ہوتی ہوگی؟ لیکن موت بھی ان کے اپنے بس کی نہ تھی ــــــ اسے یاد تھا کئی برس پہلے جب وہ اور اس کا بھائی چھوٹے تھے، مگر اتنے بھی چھوٹے نہیں کہ اتنی اہم بات یاد نہ رہ سکے کہ ماں نے ایک دن حویلی کے باغ کی سب سے زیادہ دُوری پر واقع باوَلی میں پہلے اسے پھینک دیا تھا پھر اکبر کو اور پھر خود دھم سے کُود پڑی تھی۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا، لیکن تین بار پانی میں زور زور کی آوازیں پیدا ہونے پر مالی دَوڑتا ہوا آیا تھا اور بہر حال وہ تینوں بے ہوش مگر زندہ نِکال لیے گئے تھے، اور پھر وہ مار پڑی تھی کہ چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ بی پاشا پھر تو ماں کو اور بھی زہر بھری نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔ ہمیشہ طعنہ دیتیں "اگے تو آج حرام زادی تو آرتی عزت دار حویلی پر دروغہ ہور امین (پولیس) لاکو بٹھاتی تھی نا" پیسے کِھلا پلا کر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا تھا، ورنہ سچ مُچ دروغہ اور امینوں کی فوج تو حویلی پر چڑھ چلی تھی ــــــ اُس دِن سے تو مَرنے کے بارے میں خُدا بخشی سوچتی بھی نہیں تھی۔ کبھی سوچتی بھاگ کر کہیں چلی جائے۔ تو پاگل ماں کی محبت زنجیر بن کر پیروں میں پڑ جاتی اور بھائی کا خیال الگ جی کو مارے ڈالتا، کیوں کہ کچھ دِن سے اچانک اکبر جیسے اس سے باپ کی طرح محبت کرنے لگا تھا۔ تھا تو چھوٹا، لیکن اب اس کی محبت میں وہ ایک طرح کی بُزرگی محسوس کرنے لگی تھی۔ ہُوا یہ تھا کہ اکبر نے دو چار بار دیکھ لیا تھا کہ حویلی کی ہی عورتیں لڑکیاں، جن میں نوکر مالک دونوں شامل تھیں کیسے خُدا بخشی کا مذاق بناتی تھیں، اور وہ اور بھی دُنیا سے لُٹی جاتی تھی۔ ایک دو کے تو اکبر نے ہاتھ بھی جڑ دیا تھا اور جو مالکنوں میں سے تھیں انہیں اس بُری طرح گھور کر دیکھا تھا کہ وہ بھی اپنی

جگہ سہم کر رہ گئی تھیں۔ یہ بات بی پاشا کے کانوں تک پہنچی تھی، لیکن اکبر کا حال دیکھ کر وہ خاموش رہ گئی تھیں۔

اِن دنوں نانی حضرت کی سنک میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ ایک دن چھوٹے ماموں کے بچے کی آیا اسے گود میں لئے باغ میں گھمارہی تھی کہ نانی امّی پر ضد سوار ہو گئی۔ خدا بخشی سے کہنے لگیں "میرے کو بھی گودی میں بٹھا کو چمن میں لے کو چل ہور گھما۔"

خدا بخشی انہیں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی ـــــ مگر نانی حضرت .....

وہ آگے کچھ کہتی، اس سے پہلے ہی نانی حضرت پاؤں پٹخ پٹخ کر رونا شروع کر چکی تھیں ـــــ اگے میرے کو یہ گود میں نئیں اُٹھاتی۔ دیکھو گے چھبّو ماں۔"

چھبّو ماں، یعنی بی پاشا لپکی ہوئی آئیں تو دیکھا امّی جان گود میں بیٹھنے کے لئے مصر ہیں اور خدا بخشی ٹس سے مس نہیں ہوتی ـــــ چلّا کر کہنے لگیں" اگے حرام خورنی، لیتی کیوں نئیں گودی میں۔ امّی جان کا وزن اِچ کتا ہوئیں گا ایسا۔ بڈی چمڑا تو بے چارے رہ گئے اُنوں ـــــ ہور تُو تو خالی گڈی رہ گئی کر کے چھوٹی دِکھتی ہے مگر ہے تو اچھی پکّی عمر کی نا۔"

خدا بخشی بحث میں اس وقت پڑتی جب اس کا کوئی نتیجہ نکلتا۔ نادر شاہی حکم لگ چکا تھا۔ تعمیل ضروری تھی۔ اس نے دو چار بار زور لگایا، اور آخر نانی حضرت کو کوہلے پر بٹھانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ دیکھنے والیوں کا ہجوم جمع ہو گیا ـــــ ایک دو نے خدا بخشی پر ترس کھا کر کہا بھی" لاگے میں گھما کو لا دیتی۔" لیکن بی پاشا غصہ سے بولیں" مکو مکو، امّی جان جس کو بولے وہی اِچ لینا۔ نئیں تو اُنوں کے دماغ پو ہور برا اثر پڑیں گا۔ اوّل اِچ کتے کمزور ہو گئے اُنوں۔ ضد میں آ گئیں تو اُلٹی مصیبت۔"

ہانپتے کانپتے خدا بخشی امّی جان کو باہری چمن میں لے گئی تو اکبر گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر پہلے تو وہ اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ لیکن جب اس کی سمجھ میں آ گیا

کہ نہیں یہ خواب نہیں حقیقت ہے تو وہ جھلّایا ہوا بہن کے پاس آیا اور تلخی سے بولا "یہ بڈھی کو کائے کو گود میں اٹھائی ؟"

خدا بخشی ہانپ کر بولی "اُنوں گھومتے بولے میری گود میں بیٹھ کو۔"

اکبر نے نانی حضرت کو دیکھ کر غصّے سے کہا "او بڑی اماں، خبر میں جا کو بیٹھونا ۔ بہوت ہوا گود میں بیٹھنا ——" پھر بہن سے کہنے لگا "پھینک دے اٹھا کے بڈھی کو۔"

خدا بخشی نے لرز کر بھائی کو دیکھا —— "ایسے باتاں نکو کرے اکبر۔ اچھا تو اچھا نانی حضرت کا دماغ خراب ہے اِدھر کی بات اُدھر نئیں کر سکتے، نئیں تو کبھی بی پاشا کو بول دیتے تو تیری میری دونوں کی مٹّی ہو جاتی ——"

اکبر نے محبت سے بہن کو دیکھ کر کہا "اچھا لا، مَیں گھما کر لا دیتا۔ تو بہوت تھک گئی ہوئیں گی۔"

لیکن عقل سے عاری نانی حضرت فوراً خدا بخشی سے اس طرح چپک گئیں جیسے چھوٹے بچے کسی غیر کو دیکھ اپنی ماں سے لپٹ جاتے ہیں۔

"کون بولتا کہ یہ بڈھی پاگل ہے ؟" اکبر غصّے سے بولا "ہر گز مت —— اچھی خاصی عقل والی ہے۔" یہ کہتے کہتے اس نے زور سے نانی حضرت کو اپنی گود میں لینے کی کوشش کی۔ اس کھینچا تانی میں اُنہوں نے "عو —— عو —— عو" کر کے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اندر سے نوکرانیاں، مالکنیں بھاگ بھاگ کر آنے لگیں۔

"تو بھاگ جا اکبر، تو بھاگ گے ——" خدا بخشی سہم کر بولی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اکبر چلا گیا، کیوں کہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ نہ گیا تو اس کا بدلہ بہن سے لیا جائے گا —— بی پاشا نے پچکارتے ہوئے اَمّی جان سے پوچھا "کیا ہو گیا تھا اَمّی جان۔ آپ کائے کو روئے ؟"

مگر اَمّی جان کے حواس وقت تک ساتھ چھوڑ چکے تھے اور بجائے رونے کے

وہ ہنسنے لگی تھیں۔

اَب نانی حضرت کا معمول ہو گیا تھا کہ ادھر شام کی ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہوتیں اور اُدھر انہیں خدا بخشی کی گود یاد آئی۔ پہلے تو لوگوں کو یہ تماشا نیا اور دِل چسپ لگا، لیکن جس طرح ہر نئی چیز کی آنکھیں عادی ہو جاتی ہیں، اس منظر کی بھی عادی ہو ہی گئیں کہ ایک بظاہر چھ سات سال کی چھوٹی سی بچی ایک بڑھیا کو اپنی کمر پر بٹھا کر گھوم رہی ہے، اُسے گھما رہی ہے۔

اُس دِن نانی حضرت پر ایک نئی دُھن سوار تھی —— خدا بخشی کی گود میں چڑھے چڑھے ان کی نظر اوپر اٹھی تو آسمان پر پتنگیں اُڑتی دکھائی دیں۔ خدا بخشی کے سر ہو گئیں —— "میرے کو چاندنی پولے کو چل، میں پتنگاں دیکھتی۔"

خدا بخشی نے لرز کر انہیں دیکھا، بولی: "اتے بہوت سیڑھیاں کیسا چڑھوں گی نانی حضرت میں۔"

لیکن نانی حضرت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی، وہ پھر ٹھنکیں: "میرے کو چاندنی پولے کو چلنا۔ میں پتنگاں دیکھتی۔"

اب ایک رٹ جو لگ چکی تھی اس سے فرار ناممکن تھا۔ خدا بخشی نے سر اوپر اٹھا کر بلند بانگ حویلی کی چاندنی کی طرف دیکھا، پھر زینوں کی طرف دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔

ایک زینہ —— دوسرا زینہ —— تیسرا زینہ —— پتہ نہیں کتنے جنموں میں خدا بخشی اوپر چاندنی پر پہنچی اور بے دم سی ہو کر اوپر پہنچتے ہی نانی حضرت کو کنگھورے پر بٹھا دیا۔ کنگھورے پر منڈیر نہیں تھی۔ اِدھر خدا بخشی نے نانی حضرت کو بٹھایا اور اُدھر وہ اپنا توازن کھو بیٹھیں اور سیدھی اتنی اونچائی سے زمین پر جا گریں۔

اکبر اپنے کپڑے دھو کر چاندنی پر سکھا رہا تھا۔ اس کے قریب آتے آتے یہاں یہ حادثہ رُونما ہو چکا تھا اور نیچے سے ایک شور غوغہ واویلا شروع ہو رہا تھا۔

"کیا ہُوا آپا؟" اکبر قریب آ کر پریشانی سے بولا:

خُدا بخشی تھر تھر کانپتے ہوئے بولی "اکبر، مَیں سچی بولیتوں مَیں نئیں گرائی۔ خالی میں اِدھر بٹھائی ہور اُنوں لُڑھک گئے" وہ رونے لگی ——— ڈرا سہما رونا جس میں آنسو کم اور آواز زیادہ نکلتی ہے۔ "اکبر میرے کو اب سب خوب ماریں گے، تُو میرے کو بھی کوٹ دے ....."

اتنے میں چاندنی پر لوگوں کے پرے کے پرے لگ گئے۔ سب سے پیش پیش بی پاشا تھیں۔

"اُگے حرام زادی میرے کو پہلے اِچ سے معلوم تھا کہ تُو میری اماں جان کو دشمن سمجھتی۔ میرے کو معلوم تھا کہ تو ایک دن اُن کو مار ڈالیں گی" ان کی آواز میں غصہ بھی تھا اور بین کا سا انداز بھی۔

"ابھی اُنوں دنیا کی خوشیاں اِچ کیا دیکھے تھے کہ ختم بھی ہو گئے۔ اُگے مولیٰ، یہ تیرا کیسا انصاف ہے رے۔ ابھی تو اُنوں ایک بھی تو اے کی شادی تک نئیں دیکھے۔ ان کے ارماناں آرزواں ...."

ایک دم ڈری سہمی، روتی ہوئی خدا بخشی نے سَر اُٹھا کر تیزی سے بی پاشا کو گھُور کر دیکھا اور اپنا دو پٹہ اٹھا کر دُور پھینکتے ہوئے غصے سے بولی "ارماناں؟ آرزواں؟ کس کے؟ وہ اُتے ستر سال کی کھوبڑ بُڈھی کے؟ جس کے موتہہ میں ایک دانت تھا نہ پیٹ میں ایک آنت، جس نے زندگی کا ہر عیش اُٹھائی ہر راج رچی، ہور بُڑھاپے میں بھی میری جوانی کا عرق نچوڑ نچوڑ کر پیتی رہی کہ میرے کو جوانی سے پہلے بُڈھا کر دی۔ یہ میرا آنگ دیکھو۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگتا کہ یہ اٹھارہ سال کی جوان لڑکی کا انگ ہے؟ گندگی کے پاٹ، بلغم اور تھوک کے بھرے اُگال دانان، بند کمرے میں دن رات بیٹھ کو بڈھی کے مکھیاں ہلانا، اس کا جھُوٹا کھانا کھانا ——— یہی اِچ میری زندگی تھی، یہی اِچ میری جوانی۔ میرے کو کر پا کر پا کو عمر بھر کو بوٹی بنا کو رکھ دئے، ہور آج بھی اُپر سے یہی بولتے کہ اُنوں زندگی کی خوشیاں نئیں دیکھے ———" اس نے تیزی سے اپنے کُرتے کا گریبان پھاڑ دیا۔

"دیکھو، اس سینے کو دیکھو۔ یہ ایک پانچ سال کی بچی کا دِکھتا یا اٹھارہ سال کی جوانی کا ——— جو بھی

بلندیاں سر اُٹھانے کو بے قرار تھے، وہ تم لوگاں کے ظلم سے دب کو رہ گئے ـــــ پتھر کے لوگاں اُجاڑ تم۔ خدا نے میری ماں کو، میرے کو بخش دیا، مگر تم لوگاں نئیں بخشے میرے کو۔ اجاڑ کیسے ....."

"آگے ـــــ آگے ـــــ آگے ...." اب تک سب خاموشی سے خدا بخشی کی تیز تیز باتیں سُنتے جارہے تھے، یوں اس کے گالیوں پہ اُتر آنے سے اچانک اپنی اپنی جگہ کلبلانے لگے۔ بی پاشا جو حیران حیران سی یوں ہی کھڑی رہ گئی تھیں، اپنا غصہ بین سب بھول چکی تھیں اچانک وہ آگے بڑھیں کہ خدا بخشی کو جوتوں سے کچلنا شروع کردیں کہ کوئی پیچھے سے بولی "آگے جان دیو پاشا، پاگل رانڈ ہے۔

دوسری بولی "اس کی ماں بھی تو پاگل اچ ہے۔ ماں کے اثراں آتے اچ ہیں اولاد میں۔"

کوئی پڑھا لکھا کہنے لگا "نانی حضرت پاگل تھے نا ـــــ یہ اصول ہے طب کا کہ پاگل کا تیمار دار بھی بالآخر پاگل ہوجاتا ہے۔"

"غلط باتاں مت کرو پاشا۔" اکبر ہاتھ اُٹھا کر سب کو خاموش کرتے ہوئے بولا: "میں اصل بات بتاتاؤں ـــــ جیسے جوتوں کا کارخانہ رہتا نا وہاں جوتے بنتے، کپڑوں کا کارخانہ رہتا نا وہاں کپڑے بنتے، ایسا یہ حویلی ہے نا یہ پاگل خانے کا کارخانہ ہے۔ یہاں لوگاں پاگل بنائے جاتے ـــــ یہ پاگل خانہ ہے ـــــ ہاہاہا!" وہ زور سے ہنسا۔

لیکن اس کی ہنسی میں کسی نے ساتھ نہ دیا۔

جنّتی جوڑا

آج ایک ساتھ خوشی اور غم کا دِن تھا۔ بی بی ماں کی شادی کا دِن!

چاندی کے جھم جھماتے تھالوں میں ایک قطار سے دس جگر مگر کرتے تولواں جوڑے رکھے تھے اور گیارہواں تھال، جو سونے کا تھا، اس میں سب قیمتی جوڑا سجا ہوا تھا، جس کی مجموعی قیمت پچیس ہزار سے بھی اُوپر تھی۔

اندر جہیز کا سارا کا سارا سامان سجا ہوا تھا۔ اس میں کس کس کرتے کپڑوں کے جوڑے ہی کوئی سو سے اُوپر تھے۔ یہ گیارہ جوڑے تو الگ سے اس لئے سجائے گئے تھے کہ اِن میں سچے موتی اور ہیرے ٹنکولئے گئے تھے۔ یہ بات بڑی پاشا کے جدّت طراز دماغ نے ہی سوچی تھی۔ انہوں نے بڑے نواب صاحب کو سمجھایا تھا: "میں ایسے بہوت نواب لوگاں دیکھی جو بس شادی ہوتے کے ساتھ اِچ دُلہن کے جہیز کی نخذی اور زیوراں اُڑانا شروع کر دیتے اپنی بچی کو میں اس واسطے اِچ آدھا روپیہ تو کپڑوں کی شکل میں دے رئی۔ اللہ نہ کرو کی اس کا شوہر کبھی اس کے روپے پیسے پو نظر کرو، پن وخت وخت کی بات ہے، کبھی اپنا ہور اس کے

جہیز کا سارا روپیہ بھی اتوں اُڑا ڈالے تو کم ہے کم بُرے وخت کے ساتھی یہ کپڑے لتے تو رہتا اب یہ تو اتوں کرنے سے رہے کی صندوقوں میں سے کپڑے نکال نکال کو لے کو جارہے ہیں۔ کپڑا لتا تو عورت ذات کے ہاتھ کو ارج رہتا۔ سو میں یہ ترکیب کری کی سوا لاکھ کے خریب کے ہیرے موتی کپڑوں کے جوڑوں میں ٹنکوا دی۔ ہور ایک جوڑا خاص طور سے جو شادی کے دن پہننے کا ہے۔ وہ خریب خریب پچیس ہزار کا یا اس سے بھی بڑھ کو ہوئیں گا —— کیوں میں اچھا کری ناجی ؟"

اتنی لمبی چوڑی بات کے جواب میں نواب صاحب نے صرف انہیں مسکرا کر دیکھنے پر اکتفا کی ——

"آپ کچھ بولے نئیں ؟" بڑی پاشا الجھ گئیں۔

"ہم آپ کے کاموں میں کبھی دخل دِئے ؟" وہ اسی طرح مسکرا کر بولے۔

"تو پھر چلو ذرا آپ بھی بچّی کے کپڑوں کی بہار دیکھ لیو۔"

دونوں میاں بیوی مہمانوں کے ہجوم میں سے گزرتے ہوئے جب جہیز والے کمرے میں پہنچے تو آنکھیں چُندھیا سی گئیں۔ خوشی خوشی بڑی پاشا سونے کے طشت والا جوڑا سب سے پہلے دکھانے کے لئے بڑھیں تو ان کی تیوریوں پر بَل پڑ گئے۔ سونے کے جھلملاتے طشت میں ہیروں ٹکے جوڑے کے ٹھیک اوپر ایک سادہ سرخ مدرے کا چوڑی دار پاجامہ، مدرے کا ہی کرتا اور سوتی ململ کا سستے مول کا سُرخ دوپٹہ بڑے اہتمام سے طے کیا ہوا رکھا تھا جھوٹے گوٹے اور سستی چمکیوں سے ٹنکا ہوا! انھوں نے جھلا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور خون برساتی نگاہوں سے اور اپنے پورے وجود کا زور لگا کر چلّا کر کہا "یہ کون اُجاڑ مارا اِتنے سڑی گت کا جوڑا سونے کے طشت میں رکھا سو ؟"

سارے نوکر چاکر، خواصیں، مغلانی بُوا دم بخود سانس روکے کونے کی طرف دیکھنے لگے، جہاں اپنی بے نور آنکھیں لئے رمضو بابا کھڑے کانپ رہے تھے۔

کسی اور نے یہ حرکت کی ہوتی تو بڑی پاشا گرج کر پوچھتیں ——— "تم اندھے تھے کیا؟ دکھائی نئیں کہ سونے کا تھال ہے، ہور جوڑے ہمد میانے ہیں جانے کو ہیں؟" مگر وہاں تو واقعی سابقہ ایک اندھے سے ہی تھا۔ پھر بھی وہ اپنے غصے کو دبا نہ سکیں اور پھٹ پڑیں: "تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی گے بڈّ گے میاں؟ تم دو ٹکے کے آدمی معلوم نئیں کیا کہ یہ کس کا جہیز ہے؟"

رمضو بابا بے نور آنکھوں سے خلائیں دیکھتے ہوئے بولے: "جی معلوم ہے پاشا میری بچی کی شادی ہے، ہور اسی کا جہیز ہے۔"

"تمہاری بچی؟ شرم آنا نا تم کو! یہ پھٹے کپڑے، چیتھڑے، گودڑیاں لٹکا کو ہماری شہزادی جیسی بچّی کو اپنی بچّی بولتے ...."

لیکن رمضو بابا تو صرف یہ سوچ رہے تھے کہ شہزادی پاشا اگر میری بچّی نہیں تو پھر کس کی بچی ہے؟ کیا پیدا کرنے والے باپ کو ہی یہ حق ہے کہ وہ باپ کہلائے؟ وہ اگر باپ نہیں تھے اور شہزادی پاشا ان کی بچّی نہیں تھی تو پھر یہ دنیا کون سی محبت کے سہارے قائم تھی۔

اونچی ساری ڈیوڑھی کے باہر سے پھاٹک پر پہرا دیتا ہوا عرب چاؤش بہت دیر سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ گلی کے بہت سے چھوکرے ایک نیک صورت نابینا شخص کو ہشکار رہے تھے، مانو وہ کوئی جانور ہوں۔ کوئی ان کے تہہ بند کا کونہ پکڑ کر کھینچتا، کوئی ڈاڑھی ہلا کر دور بھاگ جاتا، کوئی مضبوط قسم کا چھوکرا انہیں چک پھیری دیتا اور پھر سب مل کر قہقہے لگانا شروع کر دیتے۔

چاؤش پہلے پہل تو خود بھی مسکراتا رہا اور مزے لیتا رہا، لیکن ایک بار جب دھکا کھا کر بڑے میاں زمین پر گر پڑے تو اس نے زور سے اپنا ڈنڈا لہرایا اور چلا کر بولا "کیوں

گے حرام زادو، تمہارے ماواں نے اس واسطے اِچ جَن کر چھوڑ دیاں کیا کہ غریب ہندے کو ستاتے رہو!"

اس کے ڈنڈا لہراتے ہی سارے چھوکرے رفو چکر ہو گئے۔ چاؤش پھر بھی بڑبڑاتا رہا "اب سے اِدھر دِکھے تو حرام زادو سب کا باپ بن کر بتا دیوں گا۔" پھر وہ آگے بڑھ کر بڑے میاں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اُٹھاتے ہوئے بولے: "پھاٹک بند ہے میاں جی، تنگی کھلی ہے۔ ذرا سر نیچو کر کے اندر داخل ہونا پڑے گا۔"

انہیں سہارا دے کر کھڑکی سے اندر سے داخل کر کے وہ دونوں ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا: "مگر آپ اِدھر یہ حرام کے پوٹوں میں کیسے پھنس گئے میاں جی؟"

"کیا بولوں بٹیا —— مسجد سے ذرا چائے پینے باہر نکلا تھا کہ چھوکروں نے گھیر لئے اور بھگاتے بھگاتے معلوم نہیں کدھر کا کدھر لے کو آ گئے۔ اب میں واپس کیسا تو بھی جاؤں گا؟" اور ان کی آنکھوں میں، جو بے نور تھیں، پانی چمک اُٹھا۔

چاؤش نے اپنے گلے میں کچھ اٹکتا محسوس کیا۔ رُکتے رُکتے پوچھا: "آپ کا کوئی تو ہوئیں گا، جو ڈھونڈ کو آ کے لے جائیں گا؟"

"نہیں میاں —— میرا بس اللہ ہے۔"

چاؤش کچھ دیر کے لئے سُن سا ہو گیا، پھر خوش ہو کر بولا: "اِدھر ڈیوڑھی میں مسجد بھی تو ہئی —— آپ سارے نوکراں ہیں نہیں، ان کے بچوں کو نماز روزہ سکھلاتے بیٹھنا ——"

"ڈیوڑھی کے مالک کچھ بولیں گے تو نہیں۔ اور پھر...."

"ابھی رمضو بابا کی بات ان کے موتہہ میں ہی تھی کہ ایک ننھی سی آواز نے ان کے کانوں میں جلترنگ سا بجا دیا۔"

"بابا —— چلو سب لوگاں کھانا کھانے چل رئیں، تم بھی چلو۔"

چاؤش نے دھیرے سے بُوڑھے کو سنایا: "یہ ڈیوڑھی کے نواب صاب کی صاحب زادی ہوتے۔ اِنوں سب نوکروں کو کھانے کا نیوتا دینے آتے۔ بہت بڑی ڈیوڑھی ہے نا؟ بہوت نوکراں ہیں نا۔ سب کا کھانا ایک اِچ لگتا ـــــ چلو میاں جی۔"

"نئیں جاؤش، تم ہٹو ـــــ بابا کی اُنگلی پکڑ کو مَیں لے جاؤں گی۔"

"ہو بابا، تم کو بالکل نئیں دِکھتا ـــــ؟" معصوم سی جان بے حد پیارے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"نئیں ماں، کچھ بھی نئیں دِکھتا۔ ہور اچھا اِچ ہے کہ کچھ نئیں دِکھتا۔ دیکھنے کے واسطے دُنیا میں اچھی چیز ہے اِچ کیا؟"

"مَیں جو ہوں بابا۔" وہ خوشی خوشی بولی "مَیں بہت اچھی ہوں بابا۔ میرے گورے گورے گالاں ہیں۔ ہٹن کے ویسے چمک دار آنکھاں ہیں۔ ہور بابا خوب گھنے سنہرے بالاں بھی ہیں۔ سب لوگاں بولتے، مَیں گڑیا ویسی دِکھتی۔ تم میرے کو دیکھنا نئیں چاہیں گے کیا بابا؟"

رمضو بابا چلتے چلتے ٹھٹھک گئے۔ ان کے ویران دِل میں اُتھل پتھل سی ہوئی وہ خود پر قابو پا کر بولے "اگے واہ! مَیں کیسا اِتی اچھی بچی کو نئیں دیکھنا چاہوں گا!"

"ہو بابا۔ مَیں سچی بہوت اچھی بچی ہوں۔ دادی حضور بولتے، شہزادی ماں کو دیکھے تو آنکھوں کی جوت بڑھ جاتی ہے۔ تم میرے کو غور سے دیکھنا بابا۔ تمہارے آنکھاں ہے سوب دِکھنے لگ جائیں گا۔"

رمضو بابا نے ٹٹول ٹٹول کر اس کا ننھا سا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما، اس کے ملائم ملائم اور خوشی سے گرمائے ہوئے گالوں پر پسینے کی ہلکی سی نمی محسوس کی اور بہت محبت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہا "مَیں بھی کِتا نادان تھا بی بی ماں، جو سوچتا تھا کہ دُنیا میں دیکھنے کے لائق ہے ہی کیا ـــــ یہ دُنیا تو بہوت بھی خوب صورت

لگتی ہوئیں گی، کیوں کہ اسی میں تو تو رہتی ہے۔"

سات سال کی ننھی منی سی جان نے ایک مجبور اور دنیا سے ٹوٹے ہوئے شخص میں جینے کی ہر خوشی بھر دی۔ بی بی ماں نے ہی اپنے بابا جان تک سفارش پہنچائی —"بابا جان آپ باتاں تو نئیں کریں گے نا؟ ایک بات بولیتوں بولوں؟"

نواب صاحب نے ہنس کر اسے دیکھا —"بی بی ماں، ہم کبھی آپ کو باتاں کیے؟ بولو، کیا بولتے آپ؟"

"بابا جان۔ وہ اُنوں بڈھے سر کے جو بابا ہیں نا — اُن کو انکھیاں نئیں بابا جان — کچھ بھی نئیں دِکھتا ان کو — میں بھی نئیں دِکھتی۔ اُن کو یہیں اِچ اپنے پاس رہنے دیتے آپ؟"

"ہم کبھی آپ کی بات کو ناں بولے بی بی ماں۔"

اور نواب صاحب سچ مچ تھے بھی ایسے ہی — کسی کے کسی کام میں دخل دیتے، نہ کسی پر اپنی رائے ٹھونستے۔ البتہ بڑی پاشا نے خوب ہنگامہ کھڑا کیا۔ جب پتہ چلا تو خوب چڑ کر آئیں۔

"ہوئیں سُنی کی آپ ایک ہور مصیبت پال لئے۔"

"جانے دیو بیگم — اللہ رزاخ ہے۔"

"وہ تو ہے — میں نئیں بولی کیا، مگر اُجاڑ کیا مصیبت ہے — ایک اندھے کو رکھنا بولے تو آفت۔ کبھی باؤلی میں گر ور گیا تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"بیگم اُنوں حافظ جی ہیں — خواہ مخواہ اندھا بول کے بے عزتی کر کے گناہ کائے کو مول لیتے آپ؟" نواب صاحب نے نرمی سے کہا۔

"میں کیا بے عزتی کری جی؟ بس اِتّا اِچ بولی نا کی باؤلی میں گر گرا کو مر گیا۔؟

اب اُس کو رکھے، سو اس کے اوپر مور ایک نوکر رکھو۔ مور بڑھاؤ خرچے۔"

نواب صاحب اسی طرح نرمی سے بولے "بیگم، ہر انسان اپنا نصیب، اپنا رزخ لے کو آیا ہے۔ آپ کیوں ایسا سوچتے؟"

"مگر میں بول دی، اب رہیا سو رہیا، پن آپ تنخواہ وغیرہ نکو باندھو۔ اول اچ کتے نوکراں چُپ مُفت کی روٹیاں توڑرئے۔"

نواب صاحب نے بڑی تکلیف سے انہیں دیکھا ——"بیگم، آپ اب بولے یعنی بعد میں۔ اس واسطے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر پہلے سے بولتے تو ہم غور کرتے۔ ہم تو اُنوں تنخواہ بھی دو روپے ماہانہ باندھ چُکے۔"

"دو روپے؟" بڑی پاشا پیشانی پر ہاتھ مار کر بولیں "آپ کو کچھ بھی عقل نئیں ہے۔ کھانا کپڑا جب ڈیوڑھی سے ملیں گا تو دو روپے کائے کے واسطے؟"

"بیگم، جیتی زندگی کو سو ضرورتاں لگے وے رہتے۔ کچھ بھی کرے گا بے چارہ۔"

لیکن بڑی بیگم کے جی کو یہ بات لگ گئی کہ دو روپے خواہ مخواہ باندھ دئے گئے۔ چنانچہ اُنھوں نے بڑے میاں کے کھانے چائے میں کٹوتی کرادی، جب نوکروں کا کھانا لگتا تو بڑی پاشا خاص طور سے پتا وے والے خادم اور خادمہ سے آکر کہتیں "آج صبح اُنے بڈگا ناشتہ کر کو بیٹھا ہے۔ اب دوپہر کا کھانا نکو اِس کو۔"

انوتیاں اور بھاگ بھری ایک دوسرے کا موہنہ دیکھتے، وہ ہٹ جاتیں تو کہتے:

"اتے بڑے نواب کے بیگم ہیں اِنوں۔ کائے کو تو بھی غریبوں کے کھانے پینے کو ٹوکتے۔"

"وئی اِچ میں بھی سو چتیوں —— ایسا تو کِتا روپیہ خیر خیرات میں نکل جاتا۔ اللہ مالوم بے چارے میاں جی سے کائے کا بَیر باندھ کو بیٹھے ہیں بڑی پاشا۔"

بی بی ماں کو پتہ چلتا کہ آج رمضو بابا کا دوپہر کا کھانا ناغہ کر دیا گیا تو وہ فوراً اپنے کُرتے کے دامن میں دو تین چپاتیاں اور بُھنے گوشت کا یا مُرغی کا سالن چھُپا کر ڈیوڑھی میں

پہنچ جاتیں —— "بابا، دیکھو آپ کے واسطے میں کیا لائی ؟ بابا آپ کو دانتاں تو ہیں نا، اک دم کو تلی مُرغی تھی۔ پر بابا میں روٹی اِچ لائی، کھانا (چاول) کے ساتھ لاتی ؟ کرتے میں لاتی تو کُرتا خراب ہو جاتا۔ اَمّی جان دیکھ لیتے اور باتاں کرتے۔ اس واسطے خالی کاغذ میں لپیٹ کو روٹی مُرغی اِچ لے کو آ گئی ۔"

رمضو بابا کا دل سینے میں تھرتھرانے لگتا۔ آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہ اٹک اٹک کر نوالے نگلتے۔ اِدھر بی بی ماں مستقل اپنا ریکارڈ بجائے جاتی۔

"بابا، آپ کو آنکھیاں نئیں ہیں نا؟ کچھ بھی نئیں دِکھتا ہوئیں گا؟ یہ بھی نئیں دِکھتا ہوئیں گا کی اِتی بڑی ڈیوڑھی میں کِتّے سارے نوکراں ہیں اور کِتّا سارا کھانا بچتا؟ تو بابا پھر امّی جان آپ کو کھانا دینے کو کائے کو چڑتے؟ کیا معلوم میرے کو، مگر میرے بابا جان بالکل نئیں چڑتے۔ امّی جان تنخواہ بٹی، سو اب کے بھی بابا جان سے خوب لڑلے کی آپ کو کائے کو تنخواہ ہونا۔ مگر آپ کو مالوم بابا کیا بولے؟ بابا جان بولے جیتی زندگی کو سو ضرورتاں لگے رہتے —— بابا، آپ کو سو ضرورتاں ہیں؟ ہوئیں گے۔ نئیں تو بابا جان کائے کو ایسا بولتے —— بابا، آپ کو کبھی بھی کوئی بھی چیز کا کام پڑے تو میرے کو چپکے سے بولنا پیسے ہونا تو وہ بھی بولنا۔ میں امّی جان کی تجوری میں سے چُرا کو ...."

"ارے رے رے! توبہ توبہ بی بی ماں!" رمضو میاں اچانک اس کی بات کاٹ کر بول اُٹھتے: —— "یہ چوری چکاری کی باتاں نکو کرو آپ —— آپ کو میں سکھایا نئیں کی اللہ میاں چوری سے بہوت چڑتے۔ اور بی بی ماں، میں آپ کو کل عربی کا سبق پڑھائے بعد نصیحتاں کرا تھا نئیں کہ اپنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائے کی ماں باپ کا حکم ماننا۔ ان کے خلاف کوئی بات مت کرنا۔"

بی بی ماں بات کاٹ کر کہہ اُٹھتی "ہور آپ اِچ یہ بھی سکھائے نا کہ حضور بولے کہ بھوکوں کو کھانا کھلانا —— پھر آپ بھوکے رہے تو میں کیا کھانا مت کھلاؤں؟"

وہ سٹ پٹا جاتے۔" وہ تو ٹھیک ہے بی بی ماں ؟ پر اگر آپ کے امّی جان کے دِل میں نئیں تھا تو آپ چھُپا چُرا کو کھانا نئیں لانا تھا۔"

"میں چھُپا کو تو لائی، چُرا کو کب لائی ؟ میں تو اپنے حصّے میں سے لائی۔ اپنا حِصّہ میں کھاؤں کی کِسی کو کھلاؤں۔" پھر وہ خفا ہو کر کہتی "اچھا آپ میرے کو جھوٹی بولے نا ؟ میں اب سے آپ کے پاس نئیں آؤں گی۔"

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ چہکتی ہوئی آجاتی اور اپنی معصوم بَک بَک شروع کر دیتی۔ بیچ بیچ میں چاؤش کو گواہ بھی بناتی جاتی۔

"کیوں چاؤش، بابا خود میرے کو سبق پڑھاتے نا کی غریبوں کی مدد کرنا چاہیے ؟ اپنے حضورؐ بھی ایسا ہی سِکھائے نا ؟"

"جی ہو، بی بی ماں۔" چاؤش مُسکرا کر گواہی دیتا۔ "آپ سچّی بولتے۔"

"اچھا چاؤش، تم بابا کو اب کی تنخواہ پر لُنگی کُرتا لا دینا۔ بہوت پھٹ گیا نا" رمضو بابا اپنی جگہ سٹ پٹا جاتے۔ چاؤش الگ پینترے بدلنے لگتا۔ چاؤش کی بڑی ساری فیملی تھی۔ پانچ رُوپے مہینہ تنخواہ تھی، جو ڈیوڑھی کے سارے نوکروں سے بڑھ کر تھی، مگر پھر بھی کم بخت پُوری نہ پڑتی۔ بابا چار آٹھ آنے خود رکھ کر پُوری تنخواہ چاؤش کے حوالے کر دیتے۔

"جی ہو بی بی ماں، اب کے مہینے میں ضرور لا دیوں گا۔" وہ رُکتے رُکتے کہتا مگر وہ مہینہ کبھی نہیں آتا۔

بی بی ماں اس بھید سے لاعلم اپنی خدمات پیش کیے جاتی ——— "ہو بابا میں باباجان کو بول کے کہ ان کا ایک آدھ کُرتا پاجامہ لا کو دیوں ——— کِتّے پھٹ گئے تمہارے کپڑے ———"

"نئیں بی بی ماں، چُپ آپ کو دِکھتے کہ پھٹے وے ہیں۔ اچھے خاصے تو ہیں۔

دیکھو تو بھلا چاؤش میاں کی بی بی نے یہ پیوند لگا کو بالکل نوا کر دِ ئے ہیں یہ کرتا۔"

"مگر بابا، تمہارا کرتا سفید تھا۔ یہ پیوند تو گلابی رنگ کا ہے۔"

چاؤش اپنی جگہ جھینپ جاتا۔ بابا بات ٹالنے کو کہتے "ارے بی بی ماں، وہ تو میں اِچ بولا تھا کہ گلابی پیوند لگانا ——— پھول کے ویسا گلابی گلابی اچھا لگتا نا؟"

"اچھا بابا، میرے کو اب کے عید پر دادی ماں عیدی دیں گے تو میں تمہارے واسطے گلابی پھولاں کا کرتا پاجامہ بناؤں گی ——— آں۔"

رمضو بابا اور چاؤش دونوں ہنس پڑتے۔ بابا کہتے "نئیں ماں ——— بڈھوں کو گلابی پھولاں کیسے لگیں گے؟ سب لوگاں ہنسیں گے ——— آپ اتنا خیال رکھتے۔ بس وئی اِچ بہت ہے۔"

"نئیں بابا" وہ اپنی ہی ہانکے جاتی۔ گلابی پھولاں بہت اچھے لگتے ——— تم دیکھنا ...." اچانک وہ ٹھٹھک جاتی "ارے بابا! تم کو تو دِکھتا نئیں نا؟ بابا حکیم صاحب سارے ڈیوڑھی کے لوگاں کا علاج کرتے ——— میں باباجان سے بولوں گی تمہارے آنکھاں کا علاج کروانے کو ——— پھر بابا تم دیکھنا گلابی پھولاں کِتے اچھے ——— میں کتنی اچھی دِکھتی۔"

بابا اس کے پیار کے سمندر میں ڈوب کر کہتے "میری گڑیا، وہ تو میں اندھا ہو کر بھی دیکھتا ہوں کہ تو کِتی اچھی ہے۔"

دھیرے دھیرے، وہ چھپا چھپا کر کھانا لانے والی، بابا کی بینائی واپس آجانے کی دعائیں کرنے والی، اپنی عیدی میں سے بابا کے لئے کپڑے سلوانے کی چاہ کرنے والی بڑی ہوتی گئی۔ اس کا اردو کا پہلا قاعدہ ختم ہوا۔ پھر پہلا پارہ شروع ہوا۔ پھر اردو کی پہلی کتاب ختم ہوئی۔ پھر دوسرا سیپارہ، پھر تیسرا ——— بابا اُسے دِل لگا کر مذہب کی تعلیم

دیتے رہے ـــــــ پھر اس کا قرآن شریف ختم ہوا۔ اُردو کی قابلیت آئی ـــــــ فارسی والی اُستانی باں نے اسے فارسی سکھائی۔ انگلش پڑھانے والی نے اُسے انگلش میں طاق کیا ـــــــ وقت کا پنچھی اونچی اونچی اُڑانیں بھرتا رہا، مگر اس چہکتی مینا نے جس ڈال پر بسیرا کیا تھا وہ نہ چھوٹی ـــــــ وہ اَب بھی اسی طرح بابا کے پاس آتی۔ ان کے کھانے پینے کا اہتمام کرتی۔ یہ ضرور تھا کہ شعور آتے آتے وہ زبان کی قدر و قیمت سے واقف ہوتی گئی اور ہر دم پٹر پٹر کرتی رہنے والی مینا اب دھیمے دھیمے لہجے میں کم ہی باتیں کرتی لیکن رمضو بابا کے لئے اس کے دل میں پیار کی جڑیں گہری سے گہری ہوتی گئیں۔

بابل کے آنگن میں چہکنے والی چڑیا کب تک آزاد رہتی؟ ہوتے ہوتے بابا کے کانوں میں بھی یہ بات پڑ ہی گئی کہ بی بی ماں کی شادی ہونے والی ہے۔ کیسی خوشی کی خبر تھی۔ لیکن بابا کا دل جیسے ڈوب کر رہ گیا ـــــــ "ڈیوڑھی میں اب میرے واسطے کیا تو بھی رہ جائیں گا موئی!" وہ دل مسوس مسوس کر رہ جاتے۔ بی بی ماں اپنے گھر کی ہو رہی تھی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ دُعا کرتے کہ یہ ساعت ٹل جائے۔ ایک نہ ایک دِن تو بی بی ماں کو یہ ڈیوڑھی، یہ آنگن، یہ میکہ چھوڑنا ہی تھا۔ اچھا ہے جہاں رہے میری بچّی خوش رہے۔ لیکن اپنی بچّی کو مجھے کچھ نہ کچھ تو دینا ہی چاہیئے۔

اپنے میٹھے سبھاؤ اور نرم سلوک اور شیریں زبان کی وجہ سے بابا نے سارے نوکروں میں ایک مقام بنا لیا تھا۔ دائی ماں سے ان کے صلاح مشورے خوب چلتے تھے۔

"دائی ماں، سونا تو بہوت مہنگا ہے۔ میں بی بی ماں کو کیا تو بھی دیوں؟ ایسا سوچا ہوں کہ ایک آدھ کپڑوں کا جوڑا دیوں۔"

"جی ہو میاں جی ـــــــ ضرور دیو آپ۔ آپ کا دیا ہوا ٹکڑا بھی برکت بھرا ہوئیں گا۔ آخر کو آپ اِتا اللہ کا کلام یاد کرے وے ہیں۔"

"تو دائی ماں کم خواب کا جوڑا دیوں؟"

دائی ماں نے ترس بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ٹال کر بولیں: "ائی کم خواب کائے کو؟ اپنا دوسرا دیو کوئی" وہ جانتی تھیں کہ اتنا مہنگا کپڑا ان کے بس کا نہیں ——

"اطلس کا کیسا رہیں گا؟"

"نکو میاں جی، اطلس کے بہوت سارے جوڑے سل رئے"

"پھر جامہ دار کا؟"

"جامہ دار چھبا بولتے بی بی ماں" وہ ٹالے جاتیں

"پھر میرے کو مرد آدمی کو تو نئیں سمجھتا۔ آپ ہی کچھ مشورہ دیو"

"اب میں غریب عورت کیا مشورہ دیوں۔ آپ تو خود لائق آدمی ہیں"

"اپنا لال مدلے نئیں تو سوسی کا جوڑا اور ململ کا دوپٹہ"

"جی ہو، یہ بہوت اچھا رہیں گا"

"ہور میرے کو تو دائی ماں کچھ دِکھتا نئیں، بہوت پہلے جب آنکھاں تھے تب دِکھتا تھا۔ گھر کے عورتاں چمکی ستارے گوٹا ٹانکتے تھے —— اس سے کپڑوں پر رونق اور چمک آجاتی تھی"

"جی ہو میاں جی"

"مگر ٹانکے گا کون؟"

"ائی میاں جی، اتّے پوتیاں ہیں، چُپ کُد کڑے لگا لیتے۔ گھومتیاں پھرتیاں، اس کی آپ فکر نہ کرو۔ بس میرے کو پیسے دے دیو —— میں سوب کرلیوں گی"

"کتّے پیسے ہوئیں گے اندازے سے؟" اُنہوں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

"کپڑے —— دوپٹہ —— گوٹا —— چمکی سب ملا کو کم سے کم دس روپے تو ضرور لگ جائیں گے میاں جی"

وہ بیٹھے بیٹھے دھنس سے گئے۔ غریب چاؤش کو دے دلا کر، کبھی کبھار کے چار آٹھ آنے ہوتے ہی کیا تھے۔ ان چار آٹھ آنوں میں کبھی وہ بی بی ماں کو بیسن کے مرکل، بیر، جام خرید کر کھلا دیتے تھے۔ کبھی سستی آتی تو خود چاؤش کے ہاتھ سے ایک آدھا پیالی چائے اسلامی ہوٹل سے منگا کر پی لیتے تھے۔ اس وقت تو جیب میں دمڑی بھی نہ تھی۔ بڑی مشکل سے بولے: "شادی کب ہے مگر دائی ماں؟"

"بس تین مہینے ہی تو رہ گئے ماں۔" دائی ماں ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ "پھر تو میری مینا —— میری چہکتی بلبل میرے آنگن کو سونا کر دے گی۔"

وہ آنکھوں میں بھر آنے والے آنسو پونچھنے لگیں۔ رمضو بابا کا اپنا دل بھی نمکین پانی میں ڈوبنے لگا ——

یہ الگ داستان تھی کہ رمضو بابا نے کس طرح دس روپے کی رقم جوڑی —— اپنی چائے پانی چھوڑ دی پیٹ کاٹا۔ پاس پڑوس کے صاحبِ حیثیت بچوں کو چاؤش سے بلوا بلوا کر درس دیے۔ راتوں کی نیندیں حرام کیں، کسی کو دن میں پڑھایا، کسی کو رات میں۔ نہ چاؤش کو اپنی تنخواہ دینی بند کی نہ اس سے اُدھار سُدھار کا سوال کیا۔ بس ایک ہی دھن تھی کہ کسی طرح دس روپے جمع ہو جائیں۔ پھر یہ ڈر بھی تھا کہ ڈیوڑھی کے مالکوں کو پتہ نہ چل جائے کہ بابا آس پڑوس کے بچوں کو بلا بلا کر پڑھاتا اور پیسے وصول کرتا ہے۔ رات کو پڑھاتے، دن بھر جماہیوں پر جماہیاں لیتے۔ چاؤش کہتا بھی —— "میاں جی، اِتی سُستی آ رہی ہے تو ایک کوپ چائے لا دیوں؟"

وہ ہنس کر بولتے "اَگے نئیں میاں۔ سُستی کائے کی؟ ابھی تو سارے نوکروں کو چائے بٹی تھی۔"

اور جب دس روپے کی خطیر رقم دائی ماں کے ہاتھوں میں پہنچی تو بڑھاپا ٹوٹ کر بابا پر

برس چکا تھا۔ سفید جھاگ ایسے بال صافے میں سے جھانکتے ہوئے۔ کم زوری سے ہلتا ڈولتا جسم۔ اس کے ساتھ ہلتی کانپتی ڈاڑھی۔ ہاتھوں میں رعشہ —— دائی ماں نے رُوپے ان کے ہاتھوں سے لئے تو حیرت سے انہیں دیکھ کر بولیں: "اَئی ماں جی، آپ کا جی اچھا نئیں کیا؟ اِتّے کم زور کائے سے لگ رئے؟" وہ ٹوٹی ہوئی آواز سے بولے "میری بی بی ماں چلی جائے گی بول کے، سوچ سوچ کو یہ حال ہو گیا۔"

یہ تو سب ہی کے دِل کی آواز تھی —— دائی ماں بھی سِسک کر رہ گئی۔

سلیم شاہی، بنا آواز کی جوتیاں پہنے، آتے جاتے بڑے نواب صاحب دیکھتے کہ ڈیوڑھی میں اِدھر درزن بیٹھی لچ لچ گوٹے، سانچے، سلمیٰ ستارے، بانکڑیاں، کرنیں ٹانک رہی ہیں۔ اطلس، شامو، جامے دار، بنارسی اور کم خواب کے تھانوں کے تھان کھُلے ہیں۔ سنار مسلسل زیورات بنانے میں جُٹے ہوئے ہیں —— جوہری سچے ہیرے اور موتیوں کے پٹارے کھولے بیٹھے ہیں۔ اور اُدھر غلام گردش میں ایک جوڑا سِل رہا ہے۔ سستے مول کی چمکیوں سے اسے سنوارا جا رہا ہے —— جھوٹے لچکے سے ململ کی سجاوٹ بڑھائی جا رہی ہے، اور دو کانپتے ہاتھ اس جوڑے کو اُٹھا کر بار بار اپنی بے نور آنکھوں تک لے جاتے ہیں۔ ایک بوڑھی، لرزتی آواز بار بار پاس بیٹھی لڑکیوں سے پوچھتی ہے: "چھو کر لو، میری بی بی ماں اس جوڑے میں شہزادی لگے گی نا؟" اور لڑکیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں دُکھ سے بوجھل نظروں کا تبادلہ کر کے انہیں جیسے دلاسہ دیتی ہیں: "جی ہو میاں جی، اتّا اچھا جوڑا تو بی بی پاشا کے جہیز میں ایک بھی نئیں ہوئیں گا۔"

"خدا اس کا سُہاگ بنائے رکھے —— مجھ اندھے کا کِتّا خیال رکھتی تھی —— نہ دُنیا بار بار جنم لے گی، نہ ایسی چاند سورج کے ویسی بے مثال بچی پیدا ہوئیں گی —— میری بی بی ماں —— میری بچی ——"

"تمہاری بچی ــــــ؟" "بڑی پاشا چلائیں" شرم آنا نا تم کو ــــــ یہ پھٹے کپڑے چیتھڑے، گودڑیاں لٹکائے کو ہماری شہزادی جیسی بچی کو اپنی بچی بولتے۔"

اور انہوں نے پوری طاقت سے وہ جوڑا اٹھا کر جو پھینکا تو وہ سیدھا رمضو بابا کے پیروں میں جا پڑا۔

رمضو بابا کے آنکھیں نہیں تھیں، کان تو تھے، اور ان کے کانوں نے مدھم سی، چلنے کی چاپ سنی ــــــ پھر ان کے کانوں میں ایک ہلکی سی ضبط بھری سسکی سی ابھری کوئی قریب آیا، پھر ان کے کانوں نے یوں سنا جیسے کسی نے ان کپڑوں کا بوسہ لیا ہو۔ پھر ان کے کانوں نے باقاعدہ سنا ــــــ اور یقیناً یہ آواز ایک دردمند دل کی ہی ہو سکتی تھی۔

"بیگم ــــــ" انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی ان کے پیروں میں جھکا ہوا اور اس نے وہ کپڑے اٹھا لئے ہوں۔

"بیگم ــــــ آپ نے یہ کپڑے پھینک دئے! یہ کپڑے بیگم! جو اس دنیا میں تیار نہ ہوئے ہوتے تو صرف جنت سے ہی اتارے جا سکتے تھے اور جنہیں لے کر فرشتے بھی ڈرتے ڈرتے اس دنیا میں قدم رکھتے ــــــ آپ کو ان کپڑوں کی قدر و قیمت معلوم ہے بیگم صاحبہ ــــــ ان کے ایک ایک ٹانکے میں محبت گوندھی گئی ہے ــــــ کتنے راتوں کی جاگ اور کتنے بھوکے لمحوں کا کرب ان میں گھلا ہوا ہے ــــــ بیگم یہ جوڑا خونِ دل کی لالی سے سرخ ہے ــــــ اس کے جھوٹے گوٹے اور سستی چمکیوں پر مت جائیے۔ اس میں جو چمک ہے وہ آپ کے سارے ہیرے اور موتیوں میں مل کر بھی نہیں ہو سکتی...."

سارے مہمان، براتی، سمدھیانے والے حیرت سے کھڑے سن رہے تھے۔ وہ ایسی نرم آواز میں، جو ہزار حکموں پر بھاری تھی، دھیمے سے بولے "بی بی ماں کی عقد خوانی کے وخت اس کو یہی اِچ جوڑا پہنایا جائیں گا۔"

"مگر آپ اتنا تو سوچو، سارا حیدرآباد...."

نواب صاحب نے بیگم صاحبہ کی بات کاٹ دی : "ہم آپ کا مطلب سمجھتے ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم کسی کو کسی کام سے منع کرتے نہ کسی کے کام میں دخل دیتے —— مگر ہم آپ کو کہے دیتے ہیں کہ بی بی ماں کی شادی اسی جوڑے سے ہوگی اور رخاعدے کے مطابق شادی کا جوڑا جو دوسرے دن خیرات کر دیا جاتا ہے —— یہ جوڑا خیرات میں نہیں دیا جائیں گا۔ یہ جوڑا نسل در نسل سنبھال سنبھال کر رکھا جائیں گا کہ لوگوں کو یاد رہے کہ محبت اس طرح کی جاتی ہے اور محبت کے یادگار اس طرح سنبھال کر محفوظ کیے جاتے ہیں۔"

انہوں نے اپنے آنسو پونچھ کر رمضو بابا کے ہلتے کانپتے وجود کو سنبھالا جن کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

"زندگی میں آج پہلی بار جی چاہ رہا ہے کی خدایا میرے بھی آنکھاں ہوتے اور میں اس مہربان چہرے کو دیکھ سکتا ——" رمضو بابا کے ٹوٹے دل سے دعا نکلی اور وہ نواب صاحب سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگے۔

چٹنی

"سرکار —— آپ کو مالوم، مستی کو پیٹ ہے بول کے؟"

بڑی سرکار نے اپنی بے پناہ نگاہیں اٹھا کر بنفشہ کو دیکھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے ان نگاہوں کا سامنا کیا۔ بڑی سرکار کی شخصیت اس قدر وقار اور رعب داب رکھتی تھی کہ اچھے اچھوں کی نظریں ان کے آگے ادب اور ہیبت سے جھک کر رہ جاتی تھیں۔

"تیرے کو کیسا پتہ چلا؟" اُنھوں نے نرم سی آواز میں پوچھا۔

مستی اُن کی اپنی خاص کنیز تھی۔ جامن کی طرح اُودی جھلک لئے ہوئے سیاہ چمکتا رنگ۔ سنگِ سیاہ کی ٹھنسی ہوئی مورت۔ جسم ایسا کہ چٹکی بھرو تو انگلیاں پھسل پڑیں، لیکن گوشت اپنی جگہ ذرا بھی نہ سرکے۔ ناک نقشے کی ایسی تیکھی اور عورت پن کی وہ بے پناہ کشش کہ اُٹھتی عمر کا لڑکا نظر بھر کر دیکھ لے تو بالغ ہو جائے۔ لیکن یہ بڑی سرکار کی حویلی تھی، جہاں لڑکیوں بالیوں کو تو چھوڑیئے، کنیزوں اور خواصوں کی بھی مقدس

عبادت گاہوں کی طرح حفاظت کی جاتی —— اُس کے رنگ کی وجہ حویلی میں کسی نے اُسے مِسّی کہہ کر پکار لیا اور یہی نام زبانِ زد خاص و عام ہوگیا۔ بڑی ہوئی تو کِتنوں نے یعنی کِتنے مردوں نے مرد ہونے کے باوجود یہ تمنّا کی کہ عورتوں کی طرح سنگار کر لیں یعنی اس مِسّی کو اپنے ہونٹوں سے لگالیں۔ لیکن یہ بڑی سرکار کی حویلی تھی۔

"تیرے کو کیسا پتہ چلا؟" اُن کی بظاہر نرم سی آواز بنفشہ کے پورے وجود کو ہلا گئی۔ اُن کی آواز کی نرمی میں بھی چٹان کی سی سختی تھی۔

وہ لرز کر بولی "سرکار، اُنوں دائی ماں بول اِئے تھے۔ اُنے صبوں سے کچھ کھائی پی بھی نئیں —— اُپر سے اُلٹیوں پہ اُلٹیاں کرری بول کے۔

بڑی سرکار نے متانت میں چھپے بے پناہ غصّہ کو دبا کر نرمی سے کہا: "مِسّی اور مُغلانی اماں کو میرے پاس بُلا کو لاؤ۔"

دونوں پہنچیں تو بڑی سرکار نے مُغلانی اماں کو عزّت کے ساتھ اپنے برابر مسند پر بٹھا کر اسی نرمی سے مِسّی سے سوال کیا "کِس کا پیٹ ہے؟ چھپیا نکو!"

مِسّی نے کانپ کر اُنہیں دیکھا —— "بڑی سرکار، یہ نکو پوچھو آپ۔"

"میں پوچھتوں کِس کا پیٹ آیا تیرے کو؟" انھوں نے اُسی نرمی سے سوال کیا جو بظاہر نرمی تھی، لیکن ایسی کہ کلیجہ دہلا دے۔

مِسّی نے تھر تھر کانپتے ہوئے دوپٹے کا پلّو پیٹنا کھولنا شروع کیا —— "آپ کو معلوم نا سرکار، مَیں کبّی بھی اِدھر اُدھر نئیں جاتی۔ خالی آپ کے پاواں دبا لیتی، آپ کے بالاں کھول دیتی، آپ کے واسطے پاناں بنا کو خاص دان میں رکھ دیتی —— مگر پرسوں بارش ہورئی تھی نئیں سرکار تو مَیں تلن لے کو چھوٹے پاشا کے کمرے میں گئی تھی، فقط ....."

بڑی سرکار حیدر آباد کی تھیں —— حیدر آباد کی 'پرسوں' کا مطلب

جانتی تھیں. مُغلانی اماں سے مخاطب ہوئیں : "یہ پرسوں ، کتے مہینے کا ہوئیں گا مُغلانی اماں ؟"

"دائی ماں بول رئی تھی ، کم سے کم بھی بولے تو تیسرا لگ اچ گیا ہوئیں گا۔"

"مُغلانی اماں ——" بڑی سرکار نے خاص دان سے ایک چاندی کے ورق میں لپٹا بیڑا اُٹھا کر موتہہ میں رکھا۔ "شادی کی تیاریاں کرو —— ویسے اچ تیاریاں ہونا ، جیسے بڑے پاشا کے شادی میں ہوئے تھے۔ کوئی کمی نئیں ہونا ، اتا یاد رکھو آپ۔ ہم کو ہمارے دونوں بیٹوں سے اُتاچ پیار ہوتا۔"

مُغلانی اماں حیرت سے تحق دَق موتہہ کھولے انہیں دیکھنے لگیں —— مستی خزاں رسیدہ پیلے پتّے کی طرح لرزنے لگی۔ بڑی سرکار اسے دیکھ کر متانت سے بولیں : "تو بولی نا میں تلن لے کو چھوٹے پاشا کے کمرے میں گئی تھی فقط —— تو اب تو ہمیشہ کے واسطے اُنوں کے کمرے میں رہیں گی۔"

وہ دونوں یوں ہی پاگلوں کی طرح دیکھا کیں۔ بڑی سرکار نے اسی نرم ، مگر مستحکم لہجے میں کہا "اب تم دونوں جاؤ ہور اطمینان سے ہر ہر کام نپٹاؤ مُغلانی اماں۔ ہور اس کو منجے بٹھا دیو بولو۔"

مستی کے الفاظ کی گونج ان کے ذہن میں دھماکے کر رہی تھی : "پرسوں بارش ہور ئی تھی نئیں سرکار . . . ."

بارش ——

بارش ——

بارش ——

نواب نصیر یار جنگ کی کوٹھی اتنی بڑی تھی کہ حیدرآباد پر کوئی برا وقت پڑتا

تو وہ آدھے حیدر آبادیوں کو اس میں پناہ دے سکتے تھے۔ جتنی بڑی ان کی کوٹھی تھی، اتنا ہی بڑا اُن کا دل بھی تھا۔ اتنے سارے غریبوں کو انھوں نے برائے نام نوکریوں کا بہانہ کر کے ان کی غریبی دُور کرنے کی خاطر پناہ دے رکھی تھی کہ کوئی جوڑنے کو بیٹھتا تو لاکھوں کا خرچ تو ان نوکروں اور اُن کے خاندانوں ہی کا ہو جاتا۔

اُسی کوٹھی کے نوکر پیشہ پچھواڑے میں سیدانی بی اپنی جوان بیٹی آبرُو کے ساتھ رہتی تھیں۔ ڈیوڑھی میں مالکوں کی بھی فوج کی فوج بھری پڑی تھی، جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ سیدانی بی نے تو اپنی جوانی جیسے تیسے بچا بچا کر بڑھاپے میں ڈھال لی تھی لیکن اب جوان بیٹی کو سنبھالنا اور بچانا اُن کے لیے کارے دارد تھا۔ ایک دو نہیں کتنے سارے جوان جوان لڑکے تھے۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ نوابوں کے بچّے بھی اب انگلش اسکولوں، کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ ڈیوڑھیوں کی چاردیواری سے نکل کر باہر کی دُنیا میں وہ خود کو اور زیادہ آزاد محسوس کرتے تھے۔ اور ایسے میں جوانیوں پر بندھ باندھنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ سیدانی بی اپنے طور پر ہمیشہ بیٹی کو سمجھایا کرتیں:

"دیکھ ماں آبرُو، کبھی بھی کوئی نواب پاشا تیکو اکیلے دُکیلے میں بُلائے تو جانا نئیں ماں۔ میرے کو بھی بلاتے تھے ماں، پن اللہ بخشو سیّد صاحب بچا بچا کو رکھے۔"

آبرُو جب ذرا چھوٹی تھی تو حیرت سے پُوچھتی: "پن امّی، کام بتائے تو جانا اِچ پڑتا نا ـــــ نئیں تو ماریں گے نئیں؟"

نواب نصیر یار جنگ کی امّاں (جو دادی حضور کہلاتی تھیں) نے ہی سیّد میاں اور سیدانی بی کو بہت برس پہلے رکھا تھا۔ نوکروں کو سدا اولاد کی طرح سمجھتی تھیں، لیکن سب ہی اُن کی طرح تھوڑے ہی تھے۔ دیورانیوں، جٹھانیوں، پھر بہوؤں، پوتیوں، پوتوں کا راج آ چکا تھا۔ سب ہی اپنی نوابی کے نشے میں چُور۔ نوکر لرزتے رہتے تھے مارنا پیٹنا عام بات تھی۔

"ایسا کیسا ماریں گے؟ اپن دادی پاشا کو نئیں بولیں گے کیا؟"

"پن امّنی، اپن تو نوکر ہئیں بول کے۔ مالکوں کی شکایت کیسا تو بھی کرنا؟"

"اور ماں، میں شکایتاں لے کو بیٹھنے کا تھوڑا بول رئی ——— پن کبھی کوئی بھی زیادتی کرے تو مالکوں سے اچ تو بولیں گے نا؟"

"وہ اُنوں انور پاشا تو مارتے بھی ہور اُپر سے بولتے کی کوئی بات اپنی امّنی نے بھی نئیں بولنا۔"

سیدانی بی کے کان کھڑے ہوجاتے ——— کائے کو مارتے اُنوں؟"

"مالوم امّنی ——— ؟ بول رئے تھے تو بہوت گوری گوری ہے۔ تیرے گالا لال لال ہئیں، مُکّے دے میرے کو۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بستر پو بٹھانے لگے تو میں ہاتھ چُھڑا کو بھاگنے لگی تو میرے کو مارے بھی ہور بولے، اپنی امّنی سے بولی تو یاد رکھ..."

"ارے اللہ!" وہ سر پر ہاتھ ماریں۔ "نو دس سال کی بچّی کے سنگا تھ ایسے گندے کاماں کرنے کو کیسا یہ لوگاں کا دل بولتا!" پھر وہ گالوں پہ ہاتھ مار مار کے دعائیں بھی مانگتیں، توبہ بھی کرتیں۔

"میرے مولیٰ، میری بچّی کی آبرو کی حفاظت کر ——— تو اچ سب کا دکھوالا ہے۔"

آبرو اپنی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھولے ماں کو دیکھتی، لیکن سمجھ نہ پاتی کہ یہ کیا باتیں ہیں۔ اُسے اپنی طرف حیرت سے تکتے دیکھ کر سیدانی بی دہل کر رہ جاتیں ——— کیا خوب صورتی خدا نے دیا ماں! کاتے کو تو بھی اتی اچھی صورت دیا! جتنی اچھی صورت، اُتے بُرے نظراں پڑتے!

وقت گزرا تو ڈیوڑھی میں صرف ایک ہی نام کی دھوم تھی۔ ایک ہی ایک صورت کا چرچا تھا ——— آبرو! آبرو! آبرو!

صاف شفاف، میدہ کی سی رنگت ــــــ بڑی بڑی خواب ناک آنکھیں ــــ بال تو خدا نے ایسی فیاضی سے عطا کیے تھے کہ نہا کر اُٹھتی اور سُوکھنے پر آجاتے تو آگے پیچھے سیاہ بالوں کی ایسی چادر پھیل جاتی کہ جسم پر کپڑا ہوتا نہ ہوتا، بال ہی لباس بن جاتے۔ بے حد ستواں ناک۔ بھرے بھرے ہونٹ، اس قدر گلابی کہ کتنی بار ماں کی ڈانٹ اور مار پڑ چکی تھی کہ چھپ چھپ کے پان کھا لیتی ہے۔ پھر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے حلقے میں سما جانے والی کمر۔ اور جسم؟ عورت کے جسم کی جتنی تعریفیں آج تک شاعروں نے کی ہوں گی، ساری اس ایک جسم پر آ کر ختم ہو گئی تھیں۔ اور اس سراپا کے ساتھ مزاج ــــــ اُف! ساتھ کی لڑکیاں سکھیاں کہتیں: "اتنے تو ہری مرچی ہے، آبا۔ پوری ہری مرچی۔ ایک بات تو نئیں سہہ سکتی۔"

"خالی ہری مرچی کائے کو جی؟ چٹنی ہے چٹنی اِنے۔"

"ہو با ــــــ کوئی اور کہتی: "کیا ملوم کس کے نصیب میں جائیں گی بول کے۔ موا ساری عمر سی کرتا رہیں گا ــــــ ایسی تیز ہے اِنے۔"

"ہو ہو، تیز ہوں تو مَیں ہوں نا؟ تم لوگاں تو مِٹھے مِٹھے ہیں نا ــــــ" آبرو بھنا کر کہتی۔

کوئی تیز طرار جھٹ کہہ اُٹھتی "ہو مِٹھے ہیں کر کے تو سوب موتہہ میں رکھ لین بولتے۔ جب ہی تو دیکھ یہ چاندی کے بالیاں ملے۔ یہ زری کا دُوپٹہ مِلا ــــــ تیرے جیسی مرچی کی چٹنی کو تو کوئی زبان پو کیا۔۔۔۔ ابا نچی، پن کیا ہے تو بھی۔ کاں سے لائی گے یہ اتنے بڑے بڑے دِیدو؟"

"دیکھ صنوبر، میں بول دی ــــــ میرے سے ایسے گندے باتاں بکو کر۔ میں ویسی لڑکی نئیں ہوں، جیسے تم لوگاں ہیں۔"

بس اس جگہ آ کر تمام لڑکیوں کے دِل جل کر خاک ہو جاتے، کیوں کہ واقعی وہ

ویسی لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو ایسی لڑکی تھی جو تھی تو نوکرانی۔ لیکن ڈیوڑھی کی شہزادی جیسی سجتی تھی۔ ایک دو نہیں، پورے پانچ واقعات حویلی والوں کی یادداشت میں زندہ تھے جب لڑکے والے حویلی کی پاشازادیوں کے لئے پیغام لے کر آئے اور ہر بار آبرو کو مانگ مانگ کر گئے ــــ تنگ آکر بڑی بہو پاشا نے حکم لگا دیا کہ "اب ہے کبھی اُنے چھنال چائے ناشتہ لے کو آئی تو میں اُس کے ٹنگڑیاں توڑ کو اپنے پلنگ میں لگوالیوں گی۔"

سیدانی بی لرز کر رہ جاتیں۔

"اگے اُجاڑ ماری تو کائے کو تو بھی جاتے لے کو گئی ماں۔"

"مگر امّی"۔ وہ غصہ سے کہتی۔ "آپ بھی میرے اِچ گالیاں دے لے رئیں۔ اُتوں خود اِچ پُکارتے، ہور جاؤ تو کوستے بھی پھر ــــ"

"بس میرا اللہ، تیرے نصیب سے کوئی بھی لِڑا پڑا بھیج دے کی میرے سینے کی اُجاڑ یہ دِن رات کی دھگ دھگاٹ ختم ہوئے بول کے ــــ"

یہ بات نہیں کہ آبرو جیسی لڑکی کے لئے پیغام آتے ہی نہیں تھے، لیکن یہ بھی نصیب کی شاید ماری تھی کہ سیدانی بی چونکہ خود قرآن شریف پڑھی ہوئی تھیں، چار جماعتیں پاس تھیں، تو انہوں نے اپنا علم اپنی بیٹی کو بھی سونپا۔ اور چونکہ ذہن خدا نے اچھا دیا تھا حویلی کی پاشازادیوں کو اُستانی ماں پڑھانے آتیں تو ان کے پاس جوتوں کے قریب جا کر وہ بھی بیٹھ جاتی اور اُن کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں سے کچھ زیادہ ہی پڑھ سیکھ گئی۔ ایسے میں نچلے طبقے کے لوگ پیغام دیتے ڈرتے تھے کہ تھی تو ان ہی کے طبقے، مقام اور حیثیت کی، لیکن ایک تو بے پناہ حسن، دوسرے پڑھنا لکھنا بھی آتا تھا۔ اور نوابوں کے ہاں سے جو پیغام آتے تھے تو بڑی بہو پاشا کہتی تھیں "بخشو جائے اِتنے اُجاڑ اُگالدان صاف کرنے والی ہور پاواں دبانے والی کو 'پاشا' بن کو راج تو نکّو کرنے دیوں گی۔"

بڑی بہو پاشا کی بیٹی کی زچگی ہوئی ــــ ظاہر ہے، پہلی زچگی تو ہر بیٹی کی میکے ہی میں ہوتی ہے تو پھر بہو پاشا کی بیٹی، جو اتنے بڑے نواب دادا کی پوتی، اتنے بڑے نواب باپ کی بیٹی، اور بہو پاشا جیسی تیہے والی ماں کی "شہزادی پاشا" تھیں، کیسے اس کرّوفر سے محروم رہ جاتیں؟ سو زچگی ہوئی اور خوب ٹھاٹ باٹ سے ہوئی۔

حیدر آباد میں ایک رسم ہوتی ہے: زچہ کو تارے دکھانا۔ اس میں چھوٹے بچے کو دس دن کے بعد کمرے سے باہر آنگن میں نکالتے ہیں کہ ذرا باہر کی ہوا بھی لگے۔ اور بند کمرے میں رہتے رہتے زچہ جو تازہ ہوا سے محروم ہو جاتی ہے، اسے بھی کھلی فضا، کھلی اور تر و تازہ ہوا اور آنگن کا کھلا پن ملے۔ سات سہاگنیں، بھرے تھال، میووں سے، زیوروں سے، بھاری کپڑوں سے لدے بھرے تھال سروں پر لئے آسمان تلے آتی ہیں۔ سات کنواریاں، دودھ کے بھرے برتن لئے پیچھے پیچھے نکلتی ہیں۔ بیچ میں زچہ بچہ کو گود میں لئے کھڑی ہوتی ہے اور سہاگنیں اور کنواریاں ماں بچے کے گرد پھیرے لگاتی ہیں۔ اشرفیاں اور روپے وارے جاتے ہیں۔ بچے کا چہرہ آسمان کی طرف ہوتا ہے ــــ کہ آنکھیں آسمان کو دیکھیں۔ زچہ بھی چہرہ اوپر کئے آسمان پر سجے تارے دیکھتی ہے ــــ نیچے اشرفیاں قدموں میں، اوپر آسمان کے تارے آنکھوں میں ــــ کہ ساری زندگی ہی تاروں اور اشرفیوں میں بسر ہو۔ عورتوں کی اس رسم میں مردوں کا کیا دخل؟ لیکن نہیں جی، حویلی میں کوئی کاج ہو اور مردانہ نہ ٹپکے؟ سات سہاگنوں کو کون پوچھنے چلا تھا ــــ ہاں سات کنواریاں، جو سروں پر بھی دودھ کے برتن اور کپڑوں کے اندر بھی اسی قسم کے دل خوش کن سامان اٹھائے ہوئے تھیں، ضرور کئی ترسی ہوئی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

سب سے پیچھے آبرو، چاندی کی مٹکی لئے دھیرے دھیرے جیسے بہہ رہی تھی۔

بڑی بہو پاشا کے بڑے صاحب زادے یعنی نواب بصیر یار جنگ کے بڑے ولی عہد۔ بعد میں دوستوں سے کہتے پھرے:

"لوگاں زچہ آپا کو تو تارے تبائے، پر ہم تو چاند دیکھ لئے —— ہور وہ بھی زمین پر!"

"اجی حضت، آپ کی نوابی یہاں کام نہیں آنے والی" جاننے والے جو حویلی کی کنیزوں خواصوں کے ذریعے سارے زنانے سے آگاہ تھے اور مسلسل ٹوہ میں رہتے تھے، آبرو کے بارے میں بہت کچھ سُن چکے تھے۔ "آپ کاں رہتے نواب صاحب؟ ڈیوڑھی میں ہو کو ڈیوڑھی کے باتاں نہیں معلوم؟ اس کا نام آبرو کتے —— ہور سچ مچ آبرو سنبھال کو رکھتی"۔

"تم لوگاں پاگل ہو رے —— اُس کا ایک نام چٹنی بھی ہوتا۔ ہور ہم وہ چٹنی اپنے دستر خوان کی زینت بنائیں گے، ہور ضرور بنائیں گے —— اِتّا بول دے رتے ہم ——"

"وہ کاں ہاتھ کو آتی میاں؟" ایک نے شہ دلائی۔

"ہم نصیر یار جنگ کے وَلی عہد —— زبیر پاشا —— ہونہہ!" انہوں نے اپنی سیاہ، بانکی اونچی اُٹھی ہوئی مونچھوں کی نوکوں کو دونوں طرف سے مروڑی دی —— "تم سوب کو بتا دیں گے کی ہم جو سوچتے وہ کر بھی گزرتے۔ اصل بات یہ ہے کی پتہ نہیں، ہم سمندر میں رہے، پر ایسی چکنی، چاندی کے ویسی سِل سِل پھسلی مچھلی دیکھے کیا نہیں!"

لیکن کافی دن گزر گئے اور مچھلی ان کی گرفت میں نہ آسکی۔

پھر حویلی میں چھوٹے چچا پاشا کی شادی کا ہنگامہ اُٹھا۔

کیا شادیوں میں رَت جگے نہیں ہوتے؟ ہوتے ہیں، ضرور ہوتے ہیں۔

کیا رَت جگوں میں لڑکیاں بالیاں جاگتی نہیں ہیں؟ جاگتی ہیں، ضرور جاگتی ہیں ——

کیا جاگی ہوئی آنکھیں جام چھوڑ، پورا کا پورا شراب خانہ نہیں بن جاتی ہیں؟

ضرور بن جاتی ہیں۔

کیا جالی کے دوپٹوں سے چھنتا ہوا شباب لوگوں کو پاگل نہیں بنا دیتا؟ بنا دیتا ہوگا، ضرور بنا دیتا ہوگا۔

یہ سب ہوا —— چھوٹے چچا پاشا کی شادی بھی ہوئی۔ رت جگا بھی ہوا —— رت جگے میں سب ہی لڑکیاں جاگیں بھی۔ آنکھیں شراب خانے بھی بنیں۔ جالی کے دوپٹوں سے شباب چھنا بھی اور اُبلا بھی۔ لیکن پاگل بنے صرف زبیر پاشا۔

چونچوں، گلگلوں اور پچورے کا چاندی کا تھال لئے جب آبرو سب لڑکیوں کے بعد بڑے برآمدے سے گزری تو زبیر پاشا بڑے سے ستون سے ٹیک لگائے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں سے پئے جارہے تھے۔ نیند کا اثر اس کی آنکھوں میں تھا، اس کے دہکتے ہوئے جسم کے روئیں روئیں میں تھا، اس کی لہراتی ہوئی چال میں تھا۔ لیکن اس کا لہجہ بالکل بیدار تھا۔

"آپ کائے کو جگ رئے اب تک کا؟" وہ انہیں اپنی طرف گھورتے دیکھ کر محض بات کرنے کی خاطر بولی۔

وہ ڈر سے گئے —— وہ کسی سے نہیں ڈرتی تھی۔ ادب کا سوال الگ ہے، لیکن وہ بے حد نڈر تھی —— وہی تیز ہری مرچوں والا لہجہ۔

"زبیر نواب، یہ ڈرنے کا موقع نئیں ہے۔ اگر آج ڈر گئے تو ساری عمر ڈرتے ہی رہیں گے۔" انہوں نے خود کو ہمت دلائی۔ پھر ذرا سا مسکرائے۔

"آپ پوچھے —— آپ کائے کو جگ رئے اب تک کا؟ سچی بولنا ہم، اب قیامت تک ہم نا نیند نئیں آنے والی۔"

وہ ذرا طنز سے مسکرائی —— "یہ آپ میرے ویسی غریب نوکرانی کو آپ آپ کیوں کرلے رئے؟"

"آپ ہیں اِچ ایسی ہستی ——— آپ کبھی آئینہ نہیں دیکھے کیا؟"

"دیکھئے ———"، وہ ذرا دیر کے لئے رُک گئی کہ ساتھ والی لڑکیاں اور نوکرانیاں کافی آگے نکل جائیں اور وہ تنہا رہ جائے۔ پھر بڑے مضبوط لہجے میں بولی: "میری امّی میری ویسی اِچ حفاظت کرے ہیں جیسا کی ناگ خزانے کی کرتا۔ ہور میرے کو یہ بات بھی اچھی طرحوں سے معلوم ہے کی اگر خود لڑکی اپنی حفاظت کرنا چاہے تو کوئی موٹا کٹا مردوا بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہنس ہنس کو، نخرے دکھا دکھا کو لبھانے والے لڑکیاں آپ کو پورے حویلی میں پچاس سے بھی زیادہ مِل جائیں گے۔ آپ کو ہونا تو اُدھر جاؤ"۔ اس نے بڑے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ہور رہی میں ——— تو آپ کو بتا دیوں کی میرا نام آبرو ہے"۔

اور وہ غصّے میں ناگن کی طرح سل سل کرتی اُن کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ——— اور زبیر پاشا اپنے ہٹے کٹے مضبوط جسم کو لئے دانت پیستے، وہیں کھڑے کھڑے ایک سے ایک خیالی کھچڑی پکاتے رہے

پھر ایک دِن زبیر پاشا نوکر خانے میں سیدانی بی کے جھلنگے پلنگ پر جا کر بڑی انسانیت سے بیٹھ گئے۔ سیدانی بی بار بار سوئی میں دھاگا ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن دھاگا ہر بار ناکے کے باہر چلا جاتا۔

"اُمّی، آپ کو چشمہ بنوا دینا ہم"۔ وہ بڑی محبت سے بولے۔

"اُمّی چشمہ لگنے کے بعد ایسے ایسے بھیانک صورتاں نظر آئیں گے آپ کو کی اُس سے انسان اندھا بھلا"، کپڑے دھوتے دھوتے آبرو نے اُمّی کی طرف سے جواب دیا۔

پھر اُس نے پوری طاقت سے گیلے دوپٹے کا پانی نچوڑا، اتنی طاقت اور زور سے کہ اچھا بھلا دوپٹہ مروڑنے اور نچوڑنے سے چرچر کرنے لگا ——— زبیر نواب

نے کچھ حیرت سے اس کی حرکت کو دیکھا تو وہ مُسکرا کر بولی : " یہ دُوپٹہ پُرانا نہیں تھا، بالکل نیا تھا۔ آپ کو نہیں معلوم، غصّہ میں مَیں بالکل ناگن بن جاتی ۔" وہ زور سے ہنس دی۔ " نہ ہنستی تو شاید محفوظ رہ جاتی ۔ وہ سُنانے لگی " آپ بھی تو پڑھے لکھے ہیں ۔ معلوم کیسا نہیں ہو ئیں گا ۔ ناگن کو بولتے غصّہ آتا تو کسی کو بھی لگ جاتی، لپٹ جاتی، ہلور پینچ دے دے کر ختم کر ڈالتی ۔" وہ پھر زور سے ہنسی ۔

زبیر پاشا زخمی، پیاسی اور گرسنہ نگاہوں سے آبرو کو دیکھا کئے، سوچا کئے۔ آبرو بیگم، تُمنے کھتے ہنستے ہنستے گھر بستے ہیں —— پر تم دیکھ لینا، تمہاری یہ ہنسی سے تمہاری ہستی اُجڑ جائیں گی ۔ تُم خود کو ناگن بولے —— بجا بولے ۔ پر تم یہ نہیں سوچے کی ہم بھی تو ناگ ہو سکتے —— ڈسنے والا، سمو چے جسم میں زہر بھر دینے والا ۔

اُس دِن ٹُوٹ کر بارش ہو رہی تھی ۔

اے ہے، بارس کے مزے تو کچھ نصیر یار جنگ کی ڈیوڑھی میں ہی لُوٹے جاتے ۔ —— آسمان پہ بادل چھاتے ہی نیم، اِملی، آم کے پیڑوں میں موٹے موٹے رسّوں والے جھُولے ڈال دِئے جاتے ۔ برآمدوں میں چولہوں پہ تلَن شروع ہو جاتے ۔ جاتی گرمیوں سے ہی لہریئے دار دوپٹّے رنگ لئے جاتے ۔ برسات شروع ہوتی تو دھانی، گلابی، ہرے، نیلے، پیلے اُودے اور دھنک کے سارے رنگوں والے لہریئے دار دُوپٹّے اوڑھ اوڑھ کر جان جان کر قیامت ڈھانے کو اللہ ماریاں آنگنوں میں اُترتیں کچّے رنگ چھُٹ چھُٹ کر جوان گورے، گندمی، گندمی جسموں پر اپنی بہار بکھیر دیتے، لمبی لمبی پینگوں میں کسی کی آدھی، کسی کی پوری چوٹی کھُل جاتی ۔ گیلے کُرتے گرم جسموں سے چپک جاتے ۔ گرم جسموں کی آنچ سے گیلے کُرتے سُوکھ بھی جاتے ۔ پانی اور سوندھی مٹّی سے لپ چھپ کرتے آنگنوں سے ہو ہو کر بیبیاں اپنے اپنے کمروں میں جاتیں تو مضبوط

جوان ہاتھ اُنہیں دبوچ دبوچ لیتے۔ بیاہیاں آپس میں بعد میں مذاق کرتیں ــــــ اللہ اپنی حویلی میں برسات کے دناں میں بہوت حمل ٹھہرنے۔"

اُس دِن ٹوٹ کر بارش ہو رہی تھی

قصُور کچے گلابی رنگ کا نہیں تھا جس میں آبرو نے اپنا کُرتا، دُوپٹہ اور پاجامہ رنگا تھا۔ قصُور آبرو کا بھی نہیں تھا کہ اس عمر میں دیکھا دیکھی سب ہی لڑکیوں کا ایک ــــــ جیسی چیز پہ دل لپکتا ہی ہے۔ قصُور برسات کا بھی نہیں تھا کہ اسے تو ہر سال آنا ہوتا ہے اور وہ آتی ہی ہے ــــــ قصُور تلن کا بھی نہیں تھا کہ ایسے موسم میں تو تلن پُرن ہوتے ہی ہیں۔

قصُور ماما بی کا بھی نہیں تھا، جنہوں نے زبیر پاشا کی فرمائش پر بیسن کی پُھلکیاں تلی تھیں اور ان کے کہنے پر کہ چٹنی ساتھ میں ضرور بھجوانا ــــــ" آبرو کے ہاتھ کشتی بھیج دی تھی کہ ایک زمانہ جانتا تھا کہ سب ہی آبرو کو چٹنی کہتے تھے۔

قصُور نصیبوں کا تھا۔

آبرو، ایک تو گوری رنگت، اُوپر سے کچے گلابی رنگ کا زہر ــــــ کھلے آنگن سے ڈھکی ہوئی کشتی لے کر جب زبیر پاشا کے کمرے تک پہنچی تو سارا بدن گلابی صُراحی کی طرح چھلک رہا تھا ــــــ ابھی ابھی جھُولے پر سے یہ لمبی لمبی پینگیں لے کر اُتری تھی تو سیاہ بالوں کا ابر موتی برسا برسا کر بدن پر یہاں وہاں موتی ٹانک رہا تھا۔ دُوپٹے کے رنگ نے گالوں کو ضرورت سے زیادہ شرابی کر دیا تھا۔ سردی کے مارے ہیرے کی کنیوں جیسے دانتوں سے ہونٹوں کو کاٹے ڈال رہی تھی اور اس حقیقت سے قطعی لاعلم تھی کہ یہ اور بھی موئے، اور بھی سُرخ ہو جائیں گے، اور بھی دُشمنوں کو دعوت دیں گے کہ ایک شراب یہ بھی ہوتی ہے چکھ تو لو!

آنکھوں کے پھیلے کاجل نے آنکھوں کو کتنا بھی قاتل بنا دیا ہو، آنکھیں تو آنکھیں

ہی تھیں۔ ساری گڑبڑ ـــ تباہی، فساد، اُلٹ پُلٹ اور قیامت تو اس ململ کے کچّے گلابی رنگ سے رنگے ہوئے کُرتے نے مچائی تھی، جو جسم سے بالکل چپک کر رہ گیا تھا کچھ یوں کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کُرتا کہاں ختم ہوتا ہے اور جسم کہاں سے طلوع ہو رہا ہے سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔

طشت کو ٹیبل پر رکھ کر جب اس نے سرپوش اُٹھایا تو ذرا حیرت اور اچنبھے سے بولی "آئی ماما بوا چٹنی رکھنا بھول اِچ گئے ـــ ابھی لاتیوں۔" کہہ کے وہ جو مڑی تو ایک مضبوط کلائی والا بالوں بھرا ہاتھ اس کی چھلّا سی کمر کو جکڑے ہوئے تھا۔

"چٹنی کی ضرورت نئیں ـــ وہ تو سامنے اِچ ہے۔"

پہلے سر سے بھیگا بھیگا دوپٹہ اُترا۔ پھر دھجیاں دھجیاں ہو کر کُرتا جُدا ہوا۔ پھر دو مضبوط ہاتھوں نے اسے نرم گرم بستر پر لا پٹخا۔

"نکّو اللہ ـــ نکّو!" اُس نے اپنے بدن کو بیچ سے موڑ موڑ لیا ـــ "میرے کو ہاتھاں نکّو لگاؤ ـــ"

وہ زخمی ناگ کی طرح ہو رہے تھے۔ اُس دن تم کیا بولے، معلوم؟ ناگن کو غصّہ آتا تو کسی کو بھی بلگ جاتی۔ لپٹ جاتی ہور پینچ دے دے کو ختم کر ڈالتی، یاد آیا نا؟ خدا کرے تم کو غصّہ آؤ، ہور تم ہم کو بلگ جاؤ ـــ خوب پینچ دیو۔ خوب پینچ دیو۔ اپنا سارا زہر ہمارے انگ میں انڈیل دیو۔ اب جنّت دوزخ کی لالچ ہور ڈر کوئی چیز نئیں ـــ تم سے بڑھ کو جنّت کیا ہوئیں گی۔ ایسی جنّت کو تو اپنی زندگی دے کو بھی حاصل کرنا بولے تو زندگی ہیچ ہے ـــ حُوراں تمہارا یہ جسم دیکھے تو شرم سے پانی پانی ہو کو ڈوب کو مرجاتا ـــ ہم بِک گئے بے واماں ـــ غلام ہو گئے تمہارے ....."

اگلے ہی لمحے گلابی کپڑے کی صرف ایک ننھی سی دھجّی اس کی مُٹھی میں دبی رہ گئی

تھی - اور گلابی چاندنی پر سایہ چھا چکا تھا۔
کچھ دیر بعد باہر بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔
اندر بھی ——

حویلی میں حرام کے بچے پیدا ہونے، نہ ہونے کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اب بی بی، جہاں مرغیاں ہوں گی، مرغے تو سینے اور پر پھلا پھلا کر انہیں دبوچیں گے ہی - پھر اگر مرغیاں روز کڑ کڑا کڑ کڑا کر انڈے دیں گی تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ آبرو پر کسی نے اتنی بھی توجہ نہ دی کہ حوض کے ساتھ لگی نالی پر بیٹھی دن دن بھر الٹیاں کرتی رہتی ہے تو جا کر اتنا ہی پوچھ لے کہ "حمل ہے کی بدہضمی گے؟ حمل ہوئیں گا تو املی کھا، ہور بدہضمی ہوئیں گی تو دائی ماں سے چورن لے کو کھالے۔"

کسی کسی جلن پیٹی اور حسد بھری نے خوش ہو ہو کر طعنے ضرور دیئے: "کیوں گے بڑی نواب پاشا بنتی تھی نا؟ بولتی تھی، میں تمہارے لوگاں کے ویسی نئیں ہوں —— اب یہ گل کلاٹ کاں سے آئی پیٹ میں؟"

آبرو کچھ نہ کہتی —— البتہ سیدانی بی جیتے جی مر کر رہ گئیں۔ اگر انہیں ذرا بھی احساس ہوتا کہ بیٹی ہی ایسی ہے تو اس کا بھرتا بنا ڈالتیں، لیکن انہیں پورا یقین تھا کہ پھل ٹوٹ کر نہیں گرا، اسے توڑا گیا ہے۔

بے حد جبر کر کے، اپنے وجود پر، اپنی شرم پر لعنت بھیجتے ہوئے ایک دن سیدانی بی نے حوصلہ کر کے بیٹی سے کہہ ہی دیا

"آبرو! آبرو تو گئی ماں —— اب اس کو رکھ کے فائدہ؟ گرا دے۔" ان کا اشارہ اس کے حمل کی طرف تھا۔

"امّی ——" اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ سانس تھی یا زہریلی پھنکار کہ جس

سے ساری حویلی فق ہو سکتی تھی ——— یا شاید امّی نے ایسا محسوس کیا ہو۔) "میں آپ کو اتنا بڑا دکھ دی کی اس سے بڑا دکھ اب میری موت بھی نہیں ہو سکتا ——— مگر ایک موقع دیو امّی میرے کو ——— میرے کو میرے حال پہ چھوڑ دیو آپ۔"

زبیر پاشا کی شادی نواب برکت جاہ کی چھوٹی بیٹی سے طے پا گئی۔ بڑا بچّہ یا سب سے چھوٹا بچّہ یا بچّی، ماں باپ کی زیادہ محبت پاتے ہیں، بگڑے ہوئے بھی زیادہ تر وہی ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ کا موقع آئے تو دھوم دھڑکا بھی پہلی اور آخری تقریب پر ہی زیادہ کیا جاتا ——— زبیر پاشا، نواب نصیر یار جنگ کے پہلے بیٹے تھے، اور اسمار برکت جاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی۔ دونوں طرف سے جتنا بھی زیادہ شان و شوکت کا مظاہرہ ہوتا، تمام اُتنا ہی کم مانا جاتا ———

نصیر باغ سے برات نکل کر چلی ہے تو لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سیمنٹ کی سڑک، صدقے اور خیرات کے لٹائے ہوئے روپیوں اور اشرفیوں سے سفید اور پیلی ہو کر دمک رہی ہے۔ یہ یہاں سے وہاں تک لوگ ہی لوگ۔ سب سے پہلے خواجہ سرا بڑے بڑے گیس کے ہنڈے، قندیلیں، چاندی پیتل کے شمع دان اُٹھائے ہوتے۔ اس کے بعد بے حساب بھوئی چڑھاوے اور بری کا سامان سونے اور چاندی کے طشتوں میں اُٹھائے ہوئے۔ بری کے سامان میں ڈھیروں زیور بھی، دُلہن کے زرق برق کپڑے بھی اور منوں، ٹنوں کے حساب سے میوے بھی ——— زیور کی طشتوں کے ساتھ امین (سنتری) چل رہے تھے، اور کیرٹوں اور کھجوروں، باداموں، ناریلوں، اور دُنیا بھر کے میووں کے تھالوں کے ساتھ رکاب دار ——— کہ راستے میں غریب غربا لُوٹنا نہ شروع کر دیں، کیوں کہ وہ سارے میوے نکاح خوانی کے بعد دُلہن دُولہا پر لُٹائے جانے والے تھے۔

اس کے بعد بگھیاں، شکرامیں - ان میں معززینِ شہر —— پھر سجی سجائی شان دار بگھی - اس میں دولہا پاشا، اپنی دادی پاشا، اپنی اُمّتی حُضور یعنی بڑی بہو پاشا، نواب نصیر یار جنگ اور بھائی بہنوں کے ساتھ سجے سجائے بیٹھے تھے۔ اس کے بعد پھر شکرامیں، بگھیاں رشتہ داروں کی - آخر میں بیلوں کی بنڈیاں، جھکڑے، حویلی کے سارے نوکروں کو سمیٹے چلے آرہے تھے۔

اِن نوکروں میں آبرو نہیں تھی۔

وہ حویلی میں ہی تھی -- اس کے نہ آنے کو کسی نے بھی اہمیت نہیں دی تھی، اس لئے کہ نہ آنے والوں میں وہ اکیلی نہیں تھی - حویلی کے انتظامات، برات کی واپسی پر اتنے لوگوں کے کھانے دانے کی دیکھ بھال کے لئے درجنوں نوکر اور کچھ مرد رشتہ دار ٹھہر بھی گئے تھے۔

آبرو کی گود میں اب دو مہینے کا چھوٹا سا گول مٹول بٹیا تھا - پاؤں بھاری ہونے کا سارا وقت اس نے اپنے کمرے میں ہی کاٹا تھا، اور اب دو مہینے پہلے سے، جب سے اس کی زچگی ہوئی تھی - پوری ڈیوڑھی میں ولی عہد کی شادی کی تیاریاں، ذکر، چرچا اور ہنگامے عروج پر تھے - ان گیارہ مہینوں میں (نو مہینے حمل کے —— کہ ٹھیک اُسی بارش کی شام کو کنواری زمین کو آسمان نے ڈھانپا تھا، اور اب دو مہینے اُوپر) اُس نے ایک بار بھی زبیر پاشا کو دیکھنے یا اُن سے ملنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ اُس نے تو یہ بھی نہیں سوچا کہ یہیں اسی محل کی اس وسیع و عریض چار دیواری میں اس بچے کا وہ باپ بھی رہتا ہے جس نے پھر کبھی اس راہ پر پاؤں تک نہیں دھرا - نہ کبھی بھولے سے اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ بچے کی صورت ہی باپ کو دکھلائے، جو ہو بہو اپنے باپ کی تصویر تھا۔

برات ابھی نواب برکت جاہ کے محل تک پہنچی بھی نہیں ہو گی کہ آبرو اٹھی - اس کے حسبِ حیثیت جو بھی کپڑے اس کے بہترین کپڑوں میں شمار ہوتے تھے، وہ اُس نے

نکالے۔ مونہہ ہاتھ دھو کر دُلہنوں جیسا سنگھار کیا، چاندی کا زیور پہنا، سہاگ کی نشانی ہونٹوں پر مِستی لگائی۔ بے پناہ حسین آنکھوں کے نیچے افشاں کو حیرت کرنے کے لئے چھوڑ دیا کہ دمک دمک کر حیران ہوتی رہے کہ کیا آنکھیں ایسی بھی حسین ہو سکتی ہیں۔

جانے کب کی کچے رنگ کی پُڑیا گلابی گلابی رکھی ہوئی تھی۔ اُسے پانی میں گھول کر ہونٹوں کو خوں رنگ کیا، بال جو گیارہ مہینے کی بے پروائی سے خود رَو پودوں کی طرح اور بھی خود سرا اور سرکش ہو گئے تھے، اُس نے کنگھا پھیر کر یوں ہی چھوڑ دیئے۔ پھر جب وہ گلابی رنگ کا اپنا جوڑا پہن کر کمرے سے باہر آئی تو ایسا لگا جیسے ہر طرف روشنی سی بھر گئی ہے۔

آئینے میں اُس نے اپنے آپ کو دیکھا —— دوپٹے کو دیکھا، جالی کے گلابی کُرتے کو دیکھا، گویا قیامت کو دیکھا۔ اُس سے نیچے آئینے میں اُس کا عکس نظر نہیں آ رہا تھا۔ پاجامہ بھی گلابی تھا۔ اندرونی انجان جذبوں سے اس کی آنکھیں بھی گلابی ہو رہی تھیں۔ آج ہر شراب اس کی آنکھوں کی گلابیوں کے سامنے پھیکی تھی، ہیچ تھی۔

اُس نے جھک کر پلنگ سے اپنے بیٹے کو اُٹھایا۔ اس کی پیشانی پر ہلکے سے پیار کیا اور تیز تیز چلتی ہوئی پچھواڑے کے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

ایک ستھر رکشا کو روک کر اس نے پُوچھا۔ —— برکت نواب کی حویلی معلوم ہے تم تا —— ؟"

"ہو بی بی! معلوم نئیں تھی، پن کیا دھوم کی شادی کر رئے —— اس واسطے معلوم پڑ گئی۔ آپ اطمینان سے بیٹھو۔ ہلو ہلوے کو چلتاؤں —— تانا بچہ بھی بے ناگود میں بول کے۔ زیادہ نئیں بس ایک چھ پیسے دے دینا۔"

وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ اپنی ہی دُنیا میں گم تھی۔

نکاح خوانی میں ذرا دیر تھی۔ ایسے موقعوں پر جو ہنگامہ ہوتا ہے، وہ اپنے عروج پر تھا۔ بینڈ باجے، نفیری، تاشے گاجے۔ اُدھر اندر میراثنیں، باراتی، حویلی کے اپنے مہمان، رکشے، ہتھ رکشے، بنڈیاں، گاڑیاں، شکرامیں، تانگے، بگھیاں، اِکّا دُکّا موٹریں۔ طرح طرح کے لباس پہنے ہوئے خدّام، نوکر، چپراسی۔ شور — بے پناہ شور۔

وہ سجے سجائے مسند سے آراستہ شہ نشین سے کچھ سیڑھیاں نیچے بچّے کو لئے کھڑی سارا ہنگامہ دیکھتی رہی۔ پھر نکاح خوانی کے احترام میں بینڈ باجے، گانے، ڈھول تاشے سب بند کرا دیئے گئے۔ خاموشی چھا گئی اور قاضی صاحب گلا کھنکار کر شروع ہونے جا ہی رہے تھے —— کہ وہ اتنے سارے مردوں اور چلمنوں کے پیچھے سے جھانکتی بیبیوں کے سامنے سے ناپے تلے قدموں سے چلتی آئی۔ سونے کے پھولوں اور چاندی کے پھندنوں سے بنے سہرے میں چھپے دُولہا کے عین سامنے مسند پر بچّے کو ڈال کر بے حد اطمینان سے بولی: "یہ بچّہ کس کا ہے؟ پہچانے؟"

ایک عجیب سی بے چینی سارے میں پھیل گئی۔ دُولہا میاں نے گھبرا کر سہرا پیچھے اُلٹ دیا اور گھبرا کر بچّے کو یوں دیکھنے لگے جیسے جادو کے زور سے وہ زمین سے اُگ آیا ہو ——

"یہ کیا خرافات ہے!" نواب نصیر یار جنگ گرجے۔ "ہور چھوکری، تو ہے کون؟" اتنی بڑی حویلی —— وہ کس کس نوکر کو پہچانتے بھلا؟

چھوکری کمر پہ ہاتھ رکھے، ذرا سا ہل ہل کر بے نیازی سے مُسکراتی رہی، اور اس طرف دیکھتی رہی جدھر دُولہا میاں بیٹھے ہوتے تھے۔

اندر چلمنوں کے پیچھے بیبیوں میں، باندیوں میں، سُسرال والیوں میں کھُسر پھُسر ہونے لگی۔ معاملہ کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا، کچھ سمجھ سے باہر بھی تھا۔

"اس چھوکری کو ہور اس کے پوٹّے کو اُٹھا کو پھینک دیو یہاں سے!" نواب

نصیر یار جنگ گرجے۔

"آپ ذرا سی غلطی کرے سرکار۔ پوتے کی بجائے آپ پوتے بولنا تھا——
کیوں کی یہ آپ کا اِچ پوتا ہے۔ ہور آپ کو معلوم ہوئیں گا، بڑے بڈھے بولتے جس کا
باپ زندہ رہتا، اس کی اولاد کو پوتا نئیں بولتے۔ یتیموں کو پوتا پاتی بولتے۔ نئیں تو
بدشگونی ہوتی۔"

دُولہا نواب کی طرف دیکھ کر وہ پھر اُسی انداز سے مُسکرانے لگی—"آپ تو
کچھ بولو—— اس کو پہچانے کی نئیں؟"

سامنے ہونے والے خسر—— اُن کے برابر میں باپ—— پھر سارے خاندان
کے بزرگ اور ہم عمر—— پھر حیدر آباد کے شرفاء—— اُن کو ایک ہی بات سُوجھ
سکتی تھی، وہی سُوجھی بھی۔

"ہم نہ اس کو پہچانتے، نہ تیرے کو—— کاں کاں سے آکو مر جاتے ہور ناماں
بدنام کرتے۔" وہ بڑبڑائے۔

"تو تم میرے کو نئیں پہچانتے—— نئیں نا؟" وہ دو تین قدم آگے بڑھی۔
نرم نرم صوفوں پر بڑے بڑے نامی گرامی نواب، علماء، باریش بزرگ، مولوی صاحبان،
عمائدینِ شہر بیٹھے غور سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

وہ سیدھی آ کر ان کے عین سامنے کھڑی ہو گئی۔

"ابھی بھی نئیں پہچانے؟" اس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر عجیب بانک پن
اور حوصلہ تھا۔ اچانک ہاتھ پاؤں مارتے بچے نے رونا بھی شروع کر دیا۔

"ہمارا دماغ ہور وخت خراب مت کر چھوکری—— ہور اُٹھا اس گندگی کی
پوٹلی کو—— عورت ذات ہے بول کے چھوڑ دیئے، نئیں تو ابھی نوکراں آ کو لاتوں، گھونسوں
سے خبر لیتے بول کے۔"

وہ ذرا لہرا کر پیچھے ہٹی۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے کو موتیوں کی آب دیئے ہوئے تھی۔

"بس اب بچی آخری بار بول دیو کی آپ میرے کو واقعی نہیں پہچانتے؟" وہی جان لیوا مسکراہٹ۔

"ایک بار نہیں، سو بار نہیں —— بس، اَب نکلتی کی...."

اُس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا دوپٹہ اُتار کر دُور اُچھال دیا۔ حاضرین میں ذرا بے چینی پھیلنی شروع ہوئی —— وہ سب سے بے نیاز —— اپنے جالی کے گلابی کرتے کی طرف متوجہ ہوئی۔ گریبان کے بٹن کھولنے کی بجائے اُس نے چرر چرر کر کے گلے سے نیچے دامن تک کرتا تار تار کر ڈالا اور اسے بھی پھینک دیا۔ چند لمحے بعد چم چماتا سفید، گلابی، بھرا ہُوا جسم اب ہر قید و بند سے آزاد تھا۔ قدرت کی صناعی کا ایسا بے مثال نمونہ سامنے کھڑا تھا کہ کئی مولوی صاحبان کے ہاتھوں سے تسبیحیں چھُوٹ گریں، جنہیں اُٹھانے کی اُنہیں سُدھ تک نہ تھی۔ ایک بھی نگاہ ایسی نہ تھی جو اس بے مثال جسم پر سے ہٹنے کی بدتہذیبی گوارہ کرتی۔

"تم میرے کو نہیں پہچانتے نا؟ پن اس جسم کو تو پہچانتے ہوئیں گے؟"

خوب صورت، تپے ہوئے چہرے پر جگمگاتی، گلابی شعلے برساتی آنکھیں —— نفرت سے پھڑکتے نتھنے۔ سُرخ سُرخ ہونٹوں پر مستی کی سیاہی۔ اور ان ہونٹوں سے نکلتے ہوئے گرم گرم فقرے —— اُس سے ذرا نیچے گلابی مائل سفید گردن، جس کی رگیں، نیلی نیلی رگیں پھڑپھڑ کرتی ہوئی۔ اُس سے نیچے سنگِ سفید کی دو اُبھری ہوئی چٹانیں، جن پر چاند جیسے نُور کے ہالے دمک رہے تھے —— پھر نیچے ترشی ہوئی کمانوں جیسے خم میں، وہ کمر، جو اس کے اپنے دونوں ہاتھوں میں جو اس نے کمر پر رکھ لئے تھے، سما گئی تھی اور اُنگلیاں آپس میں گلے مل رہی تھیں ——

اور اس کے بعد ــــ قابیل نے ہابیل کا قتل ایسی ہی بے پناہ نسوانیت کے لئے کیا ہوگا۔ شاہانِ وقت نے ایسی ہی کسی قاتل اَدا کو دیکھ کر ایلورا اجنتا کی مورتیاں بنوائی ہوں گی۔ پھر سنہری روئیں سے دمکتی وہ پنڈلیاں کہ مورخ لکھنا بھول گئے ہوں تو بھول گئے ہوں، یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ تاریخ میں کئی جنگیں، ایسی ہی چاندی سونے سے بنی جوانیوں کے لئے لڑی گئی ہیں۔

قاضی صاحب گم صُم تھے ــــ باراتیوں اور حاضرین کو اب شادی کی تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی ــــ اب محفل میں جسم کہیں نہیں تھے، تھیں تو صرف آنکھیں تھیں۔

لیکن اُسے اُن آنکھوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا ــــ "اس جسم کو اب بھی نئیں پہچانتے؟" وہ زہریلے انداز سے ہنسی۔ "اس جسم کے ایک ایک حصّے کو تم سیر کئے تھے ــــ بھول گئے؟ ہور کیا کیا بولاں بول رہے تھے ــــ کی یہ تو جنت کا تحفہ ہے! میں تو حوروں سے بڑھ کو تھی نا اُس شام؟ پھر اب؟" وہ بپھر گئی۔ یہ جسم دیکھے؟ دیکھو ــــ" اُس نے اپنے نازک ہاتھوں سے سنگِ سفید کی چھاتوں تھامیں اور اُن کا رُخ زبیر نواب کی طرف کیا۔ "انوں کے لئے بولے تھے، اب ان ہاتھاں میں کوئی اور نئیں بچے گا!' پھر تم وہ اُنے ٹکّے اچور کے ولسی نواب زادی سے کائے کو تو بھی شادی کر رئے۔؟ کیا ہاتھاں آئیں گا تمہارے؟ کیا بھوت پیسہ بلیس بول کے؟ ــــ کتّا پیسہ ہونا گے لالچی؟ یا پھر بھوت پڑھی لکھی ہے اُنے ــــ؟" وہ چلّائی۔

"پڑھنا لکھنا میرے کو بھی آتا ــــ الف سے اللہ ــــ ب سے بسم اللہ۔" وہ ہنسی ــــ تلوار کی دھار جیسی تیز ہنسی۔

"پھر اسی الف سے، تیرے جیسا اُلّو بھی ہوتا۔ ہور، ب سے تیرے جیسا بھینسا

بھی ۔ ہور خاندہ پڑھاؤں ؟ ـــــ ن سے نامرد۔ ؤہ ہے ہیجڑا، جو اپنی عورت کو اپنی عورت تک نئیں بولنا چاہتا ـــــ صرف اِس دُنیا کے ڈر سے ؟ ہُونہہ !"

اُس نے اپنے نازک ہاتھوں سے چوڑیاں اُتار دیں اور پوری طاقت سے زبیر نواب کی طرف اچھال دیں۔

"اس کو پہن لیو۔ اچھا زیور ہے۔ حیدرآباد میں خالی عورتاں اچ نئیں، ہیجڑے بھی پہنتے یہ۔"

غصے میں اس کے پتھر سے ترشے بدن کی رگیں پھڑکنے لگی تھیں۔ حاضرین میں بیٹھے مرد اب طرح طرح کے پینترے بدل رہے تھے۔ سانسوں کی اُتھل پتھل کے علاوہ اندرونی اُبال سے سانسیں رُکی جا رہی تھیں۔

اُس نے لپک کر بچے کو اُٹھایا اور قالین پر تھوک کر بولی "اِتے سارے گندے انکھاں میرے بدن پو پڑے، ہور تجھے شرم نہ آئی ؟ جس بدن کو پہلی بار اور آخری بار تو نے چھوا، وہ کسی ہور کا نئیں، خالی تیرا تھا۔ اپنی عورت کو غیراں کے نگاہوں میں چھوڑا ـــــ کیا بے غیرت تمہارے تو ! اگے مرد ہوتا تو میرے کو اُدھیڑ کو رکھ دیتا کی میری ہمت تو ساروں کے سامنے ننگی کیسی ہوئی۔ پن تو مرد ہی کب ہے رے ـــــ میں تجھے وی ہتی کی ایک جسم جس تو اپنا بولا، اس کو اپنی ملکیت سمجھے گا بھی، پر تُو نے تو میرے کو چوراہے میں ننگا کر کے چھوڑ دیا۔"

ملکیت کا احساس، مرد کا وہ احساس ہے کہ دُنیا کے پہلے قتل کی بنیاد ہی اس پر رکھی گئی ـــــ اور وہ جو کہا گیا ہے کہ زر، زن، زمین فساد کا باعث ہیں، سب غلط ہے۔ مرد کی دُنیا میں ایک ہی "ز" ہے بس ایک زن۔

زن ـــــ !

زن ـــــ !

زن ـــــ !

اور کچھ نہیں۔

ایک جھٹکے سے زبیر نواب اُٹھے، سہرا توڑ کر دُور پھینکا، زرتار صافہ کھول کر آگے بڑھے —— آبرو کو اس میں ڈھانپ کر، بچّے کو گود میں سمیٹا اور حاضرین کی پروا کئے بغیر قاضی صاحب سے بولے:

"ہمارا نکاح اس لڑکی سے پڑھا دیجئے۔"

شام کو ڈیوڑھی میں بیٹے کی شادی کا ہنگامہ دیکھ کر نواب زبیر یار جنگ ذرا پریشان ہوئے، مگر بولے کچھ نہیں —— ویسے بھی اپنی شادی کے بعد سے اُنہوں نے جو الگ ڈیوڑھی بسائی تو پھر نہ کبھی یار دوستوں میں بیٹھے نہ شہر کی کسی تقریب یا شادی بیاہ ہی میں شرکت کی۔ ان کی ساری دُنیا اپنی حسین و جمیل، باوقار، باحوصلہ نرم گفتار آبرو بیگم میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ جو بھی کرتیں وہ اس میں خوش اور مطمئن رہتے۔

البتہ جب آرسی مصحف کے بعد دُولہن کا چہرہ سب کو دکھایا گیا تو زبیر نواب چونک سے گئے۔ 'مستی' دُلہن کے سنگھار میں دمک ضرور رہی تھی، لیکن ....،،

آبرو بیگم نے ان کی نگاہوں کو پڑھ لیا —— نرم، لیکن پُرعزم آواز میں بولیں: "میں اپنے حق کے لئے لڑی، ہور جیتی بھی —— دوسروں کو اُن کے حق سے کیوں محروم کروں؟ کیا اللہ کے پاس میری پوچھ نئیں ہوئیں گی جی؟"

اگلے برس

میں مملکتِ خداداد پاکستان کے عظیم الشان شہر کراچی کے قبرستان میں سر ڈھانپے، سر جھکائے کھڑی ہوں ——— اسلام کی رُو سے عورتوں کا قبرستان میں جانا منع ہے، مجھے معاف کر دے، اے خدائے پاک پروردگار! تو رحیم ہے، ارحم الراحمین ہے۔

اتنی ساری قبروں میں سے میں دِلاور میاں کی قبر کیسے تلاش کروں؟ قبر، جس میں صرف ایک دِل دفن ہے، وہ دِل جو پاکستان کے لئے دھڑکا، پاکستان کے لئے جیا، اور پاکستان کی مٹی میں بالآخر مِل گیا ——— اور وہ دِل بھی دراصل یہیں دفن ہے جو بظاہر حیدر آباد دکن کی زمین میں پیوندِ خاک ہے۔

"دلاور میاں، میں آپ کو سلام کرتی ہوں، اور یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اتنی..."

میرا سینہ پھٹنے لگتا ہے۔ آنسو میری آنکھوں سے اُبلنے لگتے ہیں۔

میں آج تک کراچی نہیں گئی، لیکن یہ خواب میں ہر سال دیکھتی ہوں۔ بچپن سے لے کر آج کے دِن تک۔ اب تو میرے بچے بھی بڑے بڑے ہو گئے ہیں۔ ہر سال چھٹیوں

میں بچے مجھ سے پوچھتے ہیں: "ممی پاکستان کب چلیں گے؟" (کیسے جائیں گے بٹیا؟)

"اگلے برس": میں رُندھی ہوئی آواز سے جواب دیتی ہوں۔

اگلے برس —— اگلے برس ... (اے زر تو خدا نیست ....)

لیکن وہ اگلا برس ابھی تک نہیں آیا ——

ساری دُنیا کے مُسلمان جانتے ہیں کہ کعبہ مکّہ شریف میں ہے اور یہ کہ حج مکّہ شریف میں ادا کیا جاتا ہے —— لیکن میں حج کرنے کے لئے زندگی میں ایک بار کراچی جانا چاہتی ہوں —— حجِ بدل۔ خدا غفور الرحیم ہے۔ وہ یقیناً میرا یہ گناہ معاف فرما دے گا، کیوں کہ وہ عالم بالغیب بھی ہے۔ دِلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ خود سَراپا مہر و محبّت ہے۔ محبّت کی قیمت جانتا ہے —— محبّت کو پہچانتا بھی ہے اور اس کی قدر بھی کرتا ہے۔ ورنہ جب اُمّتی مری ہیں تو میّت اُٹھ جانے کے بھی مدّتوں اُن کے کمرے سے خوشبوؤں کی لپٹیں نہ اُٹھتی رہتیں ——

مجھے نہیں پتہ اُمّتی کب سے ہمارے ہاں تھیں، لیکن اپنے آبائی وطن امراوتی سے خانماں برباد، جب ہم حیدرآباد دکن پہنچے، تب ہی سے وہ ہمارے ساتھ رہ گئی تھیں۔ اُن کا اپنا سارا بچپن حیدرآباد ہی میں گزرا تھا، شادی بھی وہیں ہوئی تھی وہ ہمارے لئے ایک بزرگ کا درجہ رکھتی تھیں۔ بے حد مذہبی، بڑی حد تک نماز روزے کی پابند۔ مولوی صاحب باقاعدگی سے ہم سب بچّوں کو قرآن شریف پڑھانے آتے لیکن شام کو وہ ہمیں بٹھا کر نماز سکھانا نہ بھولتیں۔

"چلو، مجھے نماز سُناؤ"

بچّے شروع کرتے تو وہ ہڑبڑا کر ٹوک دیتیں "اَئی نئیں ماں، غلط سلط نماز نکو پڑھو" پھر وہ ہمیں سکھاتیں: "بسم اللہ ... قل ہو اللہ —— بے تیری کوئی

حد؟ نہیں کوئی حد —— ولَد میں ولَد...."

بڑی ممانی چڑ کر اپنے کمرے میں ماموں ابا سے کہتیں: "اے ہے، یہ امّی کی مَت ماری گئی ہے۔ سُنا؟ سورہ اخلاص کس طرح بچّوں کو سکھا رہی ہیں؟ توبہ توبہ!"
وہ گالوں پر ہاتھ مار کر توبہ کرنے لگتیں۔

ماموں ابا بڑے اطمینان سے کہتے: "بیگم، کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ وہ بے چاری اپنے طور پر جو صحیح سمجھتی ہیں، وہی سکھاتی ہیں۔ میں نے بچّوں سے کہہ دیا ہے کہ اُن کا سکھایا ہوا یاد نہ کیا کریں۔"

"اچھا امّی، آپ نماز شروع کیسے کرتی ہیں؟" چھوٹے ماموں انہیں بے حد چھیڑا کرتے۔

وہ دوپٹہ بے حد اہتمام سے سر کے گرد لپیٹ کر کہتیں: "بسم اللہ —— شیطانِ رحیم! کمین! ذلیل! کمینہ حرامی!...."
سب لڑکیاں دوپٹوں میں مونہہ چھپا چھپا کر کھی کھی کھی کھی ہنسنا شروع کر دیتیں۔
امّی چڑ کر کہتیں "اَئی ہنسنے کی کیا بات ہے ماں؟"

چھوٹے ماموں سنجیدگی سے کہتے: "امّی، آپ تو نماز شروع ہی گالیوں سے کر دیتی ہیں۔"

وہ "توبہ توبہ" کر کے کہتیں: "اَئی نئیں ماں، وہ تو موئے شیطان کو گالی دینا ثواب ہے۔"

ماموں ابا بچّوں کو بعد میں ڈانٹتے: "نامعقولو، اُن کی ہنسی مت اُڑایا کرو۔ وہ وَلی سے بڑھ کر وَلی ہیں۔"

"اچھی وَلی ہیں، نہ ہوئیں مرد، ورنہ پیش امام بن کر سارے مقتدیوں کی عاقبت خراب کر دیتیں۔" بڑی ممانی اُلجھ کر کہتیں۔

"ارے بیگم، صرف ایک اُمتی کی وجہ سے ہم سب کی بخشش اللہ تعالیٰ کر دے گا۔
وہ تو اتنی معصوم اور پاکیزہ ہیں کہ جس طرح قران شریف بغیر وضو کے پڑھنا گُناہ ہے اسی
طرح اُمتّی کو بھی وضو کرنے کے بعد، باوضو دیکھنا چاہیئے۔"

ہر نماز کے بعد اُمتی خود بھی دُعا مانگتیں اور سارے بچّوں سے بھی کہتیں "میرے
واسطے دُعا کرنا ماں کی اللہ میرا حج کروا دے۔ 'اُنوں' سے ملا دے۔"

بڑی ممانی ایک آدھ بار جھلّا جاتیں —— "وہی اُمتّی، آپ کا یہ گُناہ تو سارو ں
کو لے ڈُوبے گا۔ اپنے 'انوں' سے ملنے کو آپ نے حج کا نام دے رکھا ہے! اللہ میاں
کتنے ناراض نہیں ہوتے ہوں گے۔"

وہ بڑی معصومیت اور سچّائی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم، نُورِ مجسّم کی حدیث
سُنانے لگتیں:

"آئی ماں، تم نے سُنے نیئں مصطفٰی میاںؐ فرمائے کی ہر عورت نے اپنے مَرد
کو سجدہ کرنا۔"

"توبہ توبہ، اُمتّی!" بڑی ممانی ہول کر گالوں کو پیٹنے لگتیں: اپنے دِل
سے آپ کچھ بھی جوڑ دیتی تھیں۔ ارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نُورِ مجسّم نے یہ تھوڑا ہی فرمایا
—— آپ نے فرمایا ہے کہ اگر میں اس بات پر قادر ہوتا تو ہر عورت کو حُکم دیتا کہ خُدا
کے بعد اگر سجدہ روا ہوتا تو وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ مطلب یہ کہ سجدہ جائز ہوتا
تو —— ! ورنہ یہ تو شرک ہو جائے گا۔"

"آئی، تو میں انوں کو سجدہ کب کر رئی ماں؟ میں خالی ایک بار اُنوں کے پاس
کراچی پاکستان جانا چاہتی۔ وُوئی اِچ میرا حج ہوئیں گا۔"

"اور آپ یہ کیا گُناہ کرتی ہیں؟ حُضور صلی اللہ علیہ وسلم نُورِ مجسّم کو آپ مُصطفٰی
میاں کہتی ہیں! آپ کا تو جب بھی نام آئے، دُرود شریف پڑھنا چاہیئے۔"

"آئی نئیں ماں، اس گنہ گار گندی زبان سے اِتّی پاک ہستی پر درود شریف پڑھ کو گناہ مول لیوں کیا؟

بس عید بخر عید کو عزت سے کبھی کبھار پکار لئے۔ سو بس ہے۔"

"اصل میں آپ کو درود شریف یاد ہی نہیں ہے، امنی" چھوٹے ماموں چھیڑتے۔

"یاد کیوں نئیں ہے، ماں؟ چھوٹے پن سے پڑھتے آرئیں۔ حضرت محمد مصطفا میاں صلّے والے آلے سلام۔"

چھوٹے ماموں کے ساتھ سارا گھر مسکرانے لگتا۔ بڑے ماموں ایک زوردار ہنکارا بھرتے تو سب اپنی اپنی جگہ سِمٹ جاتے۔

چھوٹے ماموں دھیرے سے پھر بھی چھیڑے جاتے: "لیکن پھر آپ نماز میں تو درود شریف پڑھتی ہی ہوں گی نا؟"

"وہ تو میاں مجبوری کا سودا ہوتا۔ نئیں تو سچی بات یہ ہے کی ایسا پاک نام بار بار اپنے گندے زباناں سے نکالنا بھی نئیں۔"

(حضرت اویس قرنیؒ سے لے کر امنّی تک، حضور پُرنور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بھی کیسے کیسے عاشق اللہ تعالےٰ نے پیدا کئے ہیں!)

"مَیں کہتا ہوں ——" بڑے ماموں سن گن پاکر زور سے ڈانٹتے: "ارے اس معصوم ہستی کو مت چھیڑا کرو —— خُدا کے ہاں پوچھ ہو گی۔"

لیکن بعض مرتبہ وہ خود چکرا جاتے۔ رمضان شریف کے دنوں میں امنّی پابندی سے روزے رکھتیں —— سب کو روزہ رکھنے کی تاکید بھی کرتیں۔ مگر دل کی بڑی نرم تھیں، اگر کسی کی طبیعت خراب ہوتی، یا کوئی لڑکی بالی بہانہ بھی کر رہی ہوتی کہ طبیعت ٹھیک نئیں تو وہ سارے خدائی احکام فوراً اپنے ہاتھ میں لے لیتیں۔ (ویسے بھی پورے گھر میں انہیں کی چلتی) "اَبی مت رکھ ماں —— روزے سے سچی بھی جان

ہلکان ہو جائیں گی ___"

بڑی ممانی نماز روزوں کے معاملے میں ظلم کی حد تک سخت تھیں۔ مگر اُمّی کے آگے ان کی بھی ایک نہ چلتی۔ امّی اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر کتنوں کے ہی روزے معاف کرا دیتیں کہ اَی اللہ بہوت بڑا رحم والا ہے ___ معاف کر دیتا۔ بچّی اِچ تو ہے۔"

پھر جب سحری کا وقت ختم ہوتے پر نوبت کا گولا چھوڑا جاتا، تو بھی وقفے وقفے سے اُمّی بار بار ایک ایک دو دو گھونٹ پانی پیتی رہتیں: "اللہ میاں خوش ہوتا کی اس کے بندے پانی پی پی کر اس کا شکر ادا کرتے۔"

پھر صبحِ کاذب کے بعد صبحِ صادق بھی گزر جاتی ___ کوّے کائیں کائیں کر کے صبح کی آمد کا اعلان کر دیتے، اُجالا پھیل جاتا تو وہ ماموں اَبا کے پائنتی کھڑی نظر آتیں۔

"ہو باوا، سحری کا وخت ختم ہو گیا کیا؟"

"جی ہاں، اُمّی ___ اب تو بالکل ہی ختم ہو گیا ___" وہ دھیرے سے کہتے۔
اُمّی بے حد غصّہ ہو جاتیں: "ایک گھونٹ پانی بھی نہئیں؟ پی کو اللہ کا شکر اِچ ادا کروں گی، ہور کیا کروں گی۔"

ماموں اَبا گھڑی دیکھتے ___ "نہیں اُمّی، وقت بالکل گیا ___"

"اَی، میں نے اِتّے لوگوں کے پورے پورے روزے معاف کر دی، ہور تم میرے کو اُجاڑ ایک گھونٹ پانی بھی نہئیں پینے دیئے!"

ماموں اَبا گھبرا کر کہتے: "اچھا جایئے جلدی سے بس ایک گھونٹ پی لیجے ___ زیادہ نئیں۔ پھر آسمان کو دیکھ کر کہتے: "مولا مجھ گنہ گار کو تو معاف کر دے۔"

ممانی اماں چڑ کر کہتیں "بس ایک آپ کی اُمّی اور ایک آپ۔ عاقبت کا خدا

ہی حافظ ہے اس پورے گھرانے کا۔"

"سچ مچ وہی حافظ ہے۔ اور کس کے بس کی بات ہے، ورنہ۔" وہ گلوگیر آواز سے کہتے: "ارے بیگم، اس قدر دُکھا ہُوا دِل ہے بے چاری کا۔ جی چاہتا ہے انہیں دھکا بھی نہ پہنچے —— اللہ ان کے گناہ بھی میرے کھاتے میں ڈال دے۔ مجھے غم نہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی اللہ سے۔"

افطار کے وقت البتہ انہیں کوئی جلدی نہ ہوتی —— پانی سے روزہ کھول کر نمازوں پر نمازیں پڑھے جاتیں۔ میں اپنی چھوٹی سی جائے نماز بچھائے ان کے برابر میں ہی نماز پڑھتی۔ سلام پھیر کر وہ مجھے پیار کرتیں۔ "تو میری سب سے اچھی ماں ہے۔ بول اللہ میاں سے میرے واسطے کیا دُعا مانگے گی؟"

"اللہ میاں آپ امّی کو اُن کے 'اُنوں' سے ملا دیجئے اور اُن کا یہ حج کرا دیجئے ——"

وہ میری بلائیں لے کر گلے لگا لیتیں —— خُدا تیرے نصیب اچھے سے اچھے کرے ماں —— تو چاند سورج کے ویسی دُنیا میں چمکو —— اللہ تیری یتیم یسیر کی زبان کی دُعا قبول کرلے۔"

مجھے کچھ پتہ ہی نہیں تھا کہ 'اُنوں' کون ہیں اور امّی سے ان کا کیا رشتہ ہے اور وہ ہر نماز کے بعد مجھ سے 'اُنوں' سے ملنے کی دُعا مانگنے کو کیوں کہتی ہیں —— بس امّی گھر کے سارے بچوں سے زیادہ محبت مجھ سے کرتی تھیں، اس لئے میں بھی اُن کی ہر بات دل سے مان لیتی۔

عید آتی تو سارے گھر کی لڑکیاں بالیاں 'بیاہی' اَن بیاہی عورتیں، سب ہی مہندی لگاتیں۔ رنگ برنگی چوڑیاں پہنتیں —— چوڑیوں والی بیچ آنگن میں نیم کے چھتنار درخت تلے اپنا ٹوکرا کھول کر بیٹھ جاتی۔ چائے، پان، تمباکو سے اس کی تواضع

کی جاتی۔ پھر سب کے ہاتھ، گورے، سانولے، دُبلے بھرے بھرے، گُندھی، جوان، اُدھیڑ، بیاہے، اَن بیاہے ہاتھ اس کے آگے بڑھتے۔ جھم جھماتے، چُوڑیوں کے جوڑوں سے سجے ہاتھوں سے سب سے پہلے چُوڑی والی کو سلام، آداب کیا جاتا —— وہ دُعاؤں سے لاد دیتی —— "بھگوان تھُس رکھے"۔

"بیٹھک سے خالو ابا، بڑے ماموں اور دوسرے بزرگ یہ منظر دیکھتے —— ایک دوسرے سے نظر بچا کر کچھ معمول سے بھاری آواز میں بڑے ماموں ابا کہتے:

"کجری، اُمّنی کو ہری چُوڑیاں پہنا دے"۔

جھُرّیوں بھرے ہاتھوں میں ہری ہری چُوڑیاں پہنتے وقت اُمّنی کا شگنوں سے بھرا چہرہ تمتما جاتا۔ (یہ تو میں بعد میں بڑی ہونے پر سوچ سکی) وہ ہاتھ گھما گھما کر ہری بھری چُوڑیاں دیکھتیں اور عمر میں بڑی ہونے پر بھی چُوڑی والی کو آداب کرتیں۔ وہ بھی موںہہ بھر کے دُعائیں دیتی: "بھگوان کرے اُنوں، جلدی سے آو، نئیں تو۔ رنج اُن کئے جاؤ —— ہاتھاں ایسے اِچ بھرے بھرے رہنو ——"۔

لیکن پوسٹ مین آتا بھی تو اُمّنی کا کوئی خط پتر نہ لاتا۔

پھر اتنے سارے سال گزر گئے کہ زندگی کے معنی آپ ہی آپ سمجھ میں آگئے —— کتنی ساری اندوہ ناک حقیقتیں علم میں آئیں۔ (بچپن کی بے خبری کتنا دِل کش طلسم ہے۔)

مجھے بڑی پا کر اُمّنی نے مجھے اپنا رازدار بنا لیا۔

"اَئی بیبا —— پاکستان کتی دُور ہے ماں؟"

"کاہے کے لئے اُمّنی؟"

وہ شرمائیں۔ "اب اُنوں نئیں آئے تو میں اِچ کیسا بھی کراچی کو چلی جاتی —— ہو ماں، اب نئیں رہتی اُنوں کے بغیر ——"

پرمٹ، پاسپورٹ، ویزا کے چکر مَیں انہیں کیسے سمجھاتی ——

"پاکستان بہت —— بہت دُور ہے اُمّی!"

"وہ غصّہ سے کہتیں —— "اَئی، پہلے تو ایکچ تھا ہندوستان، پاکستان —— اب دُور کائے سے ہوگیا یوں کے؟"

مَیں بے بسی سے کہتی —— "بہت دُور ہو گیا ہے، اُمّی۔ پہلے ایک ضرور تھے ہندوستان، پاکستان —— لیکن اب دو ملک ہو گئے ہیں یہ —— اس کے علاوہ اور مصیبتیں بھی ہیں —— حکومتیں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔

"اَئی، اب کوئی میرے جسم کے دو ٹکڑے کر کے بولے کی میں دو ہو گئی تو دو ہو جاؤں گی کیا میں؟ رہوں گی تو ایکچ نا، چاہے کتے بھی ٹکڑے کردیو میرے ——"

مَیں روہانسی ہو گئی —— "اُمّی، اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ پاکستان، ہندوستان اب الگ الگ، دو ملک ہو گئے ہیں۔"

"تو بیچ میں دیوار اُٹھ گئی کیا؟"

"ایسا ہی سمجھ لیجیے۔"

"ہور کوئی دیوار پو سے کُود کو اُدھر چلا گیا تو؟"

"اُمّی دیوار بہت اونچی ہے۔ اور بیچ میں جو دروازہ ہے نا، اُس میں خوب بڑا سارا قفل ہے۔"

"خوب بڑا سارا قفل؟ ہور اس کی کُنجی کس کے پاس ہے؟"

"اُمّی، یہی تو نہیں پتہ کہ اس کی کُنجی کس کے پاس ہے ——" میں رُک رُک کر بولی —— "کُنجی کہیں کھو گئی ہے اُمّی۔ کسی کو بھی نہیں ملتی۔"

دوسرے دن سڑک پر سے لوہار "چابیاں بنوا لیو! چابیاں بنوا لیو!" کی صدا لگاتا ہوا گزر رہا تھا۔ مَیں بیٹھی اپنی پڑھائی کر رہی تھی، کچھ غور بھی نہیں کیا۔ تھوڑی دیر بعد

امّی کی آواز آئی "ہو باوا، تم اٹکل سے کوئی چابی بنا سکتے کیا؟"

لوہار تھوڑے تذبذب میں پڑ گیا —— اٹکل سے؟" ہو امّاں، اندازے سے بنا تو سکتے۔ پن معلوم تو ہونا کی کتّا بڑا تالا ہے، کیسا ہے —— جرمنی کا ہے کی علی گڑھ کا؟"

"اگے باوا وہ پاکستان ہندوستان کے دروازے پو جو قفل پڑا ہے کی نئیں ...."

دیوان خانے سے تقریباً روتے ہوئے ماموں ابّا نکل کر آئے، امّی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لائے اور آنسو چھپا کر بولے :

"امّی میں آپ کو اپنی جان بیچ کر بھی پاکستان لے جاؤں گا۔"

حیدر آباد دکن میں نظام سرکار کے زمانے میں صبح ہی صبح شہر میں لال مٹّی بیچنے والے نکلتے تھے۔ برتن مانجھنے، گھر میں پُتائی کرنے کے لئے بیل گاڑی میں لاد کر یہ لال مٹّی گلی گلی بیچی جاتی۔ امیروں کے نوکر اور غریب خود دروازوں میں کھڑے ہو کر یہ مٹّی خریدتے۔ اُس زمانے میں حیدر آباد کے ایک آنے میں چھ پیسے ہوتے تھے۔ ایک پیسے میں ہنڈیا بھر مٹّی آجاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی خالی ہو جاتی۔

اُس دِن امّی دروازے میں جا کر کھڑی ہو گئیں ——

"ہو باوا مٹّی والے!" اُنہوں نے آواز دی۔

"مٹّی ختم ہو گئی امّاں؟" مٹّی والا دُور ہی سے چلّایا۔

"نکو باوا، میرے کو مٹّی نکو —— تم اپنی خالی بنڈی میں کرایہ کرتے کیا؟"

"ہو کرتا تو ہونچ امّاں۔ پن کھانے کا وخت ہو گیا۔ پھر بھی کاں جانا ہے تم نا؟"

وہ کچھ آگے بڑھ کر بولیں —— "بٹیا، مجھے پاکستان لے جا کو چھوڑ

دتیا ماں؟"

گاڑی والے نے ذرا حیرت سے اُنہیں دیکھا، بولا کچھ نہیں ـــــ میں نے کھڑکی سے یہ سارا ماجرا دیکھا ـــــ غصّے کی ایک لہر میرے تن بدن میں سارے گھر والوں اور خاص طور سے بڑے ماموں کے خلاف رینگ گئی ـــــ میں غصّے سے بھری دیوان خانے میں پہنچی۔

"ماموں ابا! میرے آنسو اُبلنے کو بے تاب ہو رہے تھے" آپ امّی کو کب تک دھوکا دیتے رہیں گے؟ آپ انہیں پاکستان پہنچا کیوں نہیں دیتے؟"

بڑی دیر تک ماموں ابا خاموش رہے ـــــ پھر سر اُٹھا کر بولے: "کِس کے پاس پہنچاؤں؟"

"کِس کے پاس؟" غصّے میں بھی مجھے ہنسی جیسی آگئی " ارے ماموں ابا، اُن کے 'اُن' کے پاس ـــــ اور کِس کے پاس؟"

"بٹیا ـــــ" وہ سر جھکا کر دھیرے دھیرے بولنے لگے۔ "اُن کے 'اُن' دلاور میاں تو ۱۹۴۷ میں ہی پاکستان جاتے ہوئے راستے میں شہید کر دیے گئے تھے۔"

"نہیں ماموں ابا نہیں!" میں اتنی زور سے چیخی کہ سارا گھر ہل سا گیا۔

ماموں ابا دھیرے دھیرے کہتے رہے: "چھوٹے تایا، جن کے ساتھ پاکستان کی محبت میں دلاور میاں گھر بار، ماں باپ، ماں بننے والی دُلہن کو چھوڑ چھاڑ کر چلے تھے، ٹرین میں ہی قتل کر دیے گئے۔ چھوٹے تایا ٹرین سے کچھ دیر پہلے ہی پیشاب کرنے اُترے تھے۔ شاید انہیں خدا نے زندہ رکھنا چاہا تھا ـــــ واپس آئے تو ساری ٹرین قیامت سے دوچار ہو چکی تھی۔ دلاور میاں کئی ٹکڑوں میں بٹے ہوئے پڑے تھے ـــــ چھوٹے تایا نے لکھا تھا ـــــ کتنی ہی دیر تک تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کیا ہو گیا۔ پھر ان کے جسم کے ٹکڑے دیکھے ـــــ وہ اَدھ کھُلی آنکھیں دیکھیں جو پاکستان کا دیدار کرنا چاہتی

تھیں ـــــ وہ جوان جیتا جیتا سُرخ لہو دیکھا جو مِٹّی میں مِل کر رائیگاں ہو گیا تھا ـــــ اچانک مجھے ایک خیال آیا ـــــ اس خیال سے مَیں خود ہی لرز گیا۔ بہر حال مَیں نے سوچا، مرنے والے نے جس سرزمین کے پیار میں موت کو گلے لگا لیا تھا، اسے اس کے پیار سے بالکل ہی محروم نہ کروں۔ مَیں نے ان کے کٹے ہوئے جسم کا وہ حصّہ کپڑے میں احتیاط سے رکھ لیا جس میں ان کا دِل تھا، بڑی مشکلوں سے، کیا بتاؤں کِن کِن پریشانیوں اور جتنوں سے مَیں اس امانت کو کراچی تک سنبھال کر لایا ـــــ اور اب وہ دِل کراچی کے شہرِ خموشاں میں دھڑک رہا ہے۔ مَیں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ دل دفن ہے۔ سچّے عاشق کا دل کبھی نہیں مر سکتا۔ بٹیا پارٹیشن سے پہلے بھی اپنے رشتہ دار حیدر آباد میں رہتے تھے۔ اَمّی اپنی نوکر نہیں ہیں، غریب رشتہ دار ہیں ـــــ بڑی دُکھی، بڑی معصوم .... "

مَیں بن آنسوؤں کا رونا رو رہی تھی، جو دل کے اندر میں سیلاب بہا دیتا ہے، لیکن آنکھیں خشک ہی رہتی ہیں۔

"بٹیا، یہ بات کسی کو بھی نہیں معلوم۔" ماموں ابا دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے "خود اَمّی کو بھی نہیں معلوم۔ ہم جان بوجھ کر انہیں عید پر ہری چوڑیاں پہناتے ہیں، رنگین کپڑے پہناتے ہیں کہ اُن کی اُمیدیں زندہ رہیں۔ ہم نے پہلے پہل تو یہ خبر یوں چھپائی کہ وہ اُمید سے تھیں۔ پھر بچہ پیدا ہوُا تو اس ڈر سے چھپائی کہ دودھ نہ سوکھ جائے بچے کی صحت متاثر نہ ہو جائے، لیکن دُکھیا بیوہ کا یہ اکلوتا اور آخری سہارا بھی چھن گیا۔ پھر سوچا کہ اب بتا کر فائدہ بھی کیا ہے۔ کم سے کم اُمید کا ایک چراغ تو اُن کے دِل میں روشن ہے۔"

پھر مَیں نے کبھی یہ چراغ بجھانے کی کوشش نہیں کی ـــــ اَمّی نمازیں پڑھ پڑھ کر دُعائیں مانگتیں، گھر بھر کے بچوں سے بھی کہتیں: "ماں، میرے واسطے دعا مانگو،

اللہ میاں سے کی اُنوں کو لا دے یا میرے کو پاکستان پہنچا دے بول کے۔"

بقول اُن کے، کہ ان کی گنہ گار زبان اس لائق نہیں کہ بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نُورِ مجسّم کا نام لینے کی جسارت کرے، عید، بقرعید پر وہ دُعا مانگتیں:

"اے اللہ میاں کے پیارے محمد مصطفےٰ میاں، اللہ آپ کو جہاں رکھے خوش رکھے۔ آپ چاہے تو مکّے میں رہو کی مدینہ میں۔ دِل بولے تو حیدر آباد آ کو رہو۔ پن آپ اللہ سے میرا اتّا سند لیہ دے دیو کی یہ گنہ گار اپنے اُنوں سے فقط ایک بار ملنا چاہتی بول کے۔"

پھر وہ بے حد گلوگیر آواز میں کہتیں "ہور یہ میرا حج ہوئیں گا — حج کے معنی کیا ہیں اے خدا! تیری محبّت نا؟ تیری محبت ہور تیرے بندوں کی محبّت۔ ہور بیوی کے واسطے تُو تو بولا نا رے خُدایا کی اس حالت میں مری کی اس کا شوہر اُس سے خوش ہور راضی تو جنّت کے کوئی بھی دروازے سے اُسنے میں داخل ہو جانا — سو میرے کو اُنوں سے ملنے کا، ان کی خِدمت کر کے اُنوں کو خوش ہور راضی رکھنے کا موقع دے ہور میری یہ عبادت ہور یہ حج قبول فرما۔"

ہلکی ہلکی پھوار ساون کا سند لیہ لاتی۔ نیم کے چھتنار درخت پر موٹے رسّے کا جھولا بندھ جاتا۔ ایک ہلور ہلڑ جھولا جھولنے والیوں کی رہتی۔ لڑکے بھی اس میں شامل ہو جاتے۔ عورتیں، لڑکیاں اچھّی، بُری آوازوں میں گانے لگتیں۔ تلن ہوتے، باورچی خانے کا چُولہا چھوڑ وہیں آنگن میں جھولے سے ذرا ہٹ کر چولہے بنا لئے جاتے — بارش کی پھوار گرم گرم انگاروں پر گرتی تو چھن چھن آواز آتی — امّی بڑی حسرت سے بجھتے انگاروں کو دیکھتیں۔ پھر اندر دالان میں چولہے نئے سرے سے سُلگائے جاتے۔ تلن ہونے لگتے —

"کوئی خط آیا ہو باوا 'اُنوں' کا؟" اَمّی گھر کے بڑے مردوں کو ہمیشہ 'ہو باوا' کہہ کر مخاطب کرتیں۔

بڑے ماموں ٹال جاتے ——— "اچھے ہی ہوں گے اَمّی"۔

چھوٹے لڑکوں، لڑکیوں کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ پاکستان سے ڈاک بھی بند تھی۔ مذاق کا حیلہ مِل جاتا ——— کوئی کہتی: "اَمّی، 'انوں' نے وہاں شادی کرلی ہے، ایک اور ———"

"کرنے دیو ماں ——— مَردوئے آدمی کو چار چار عورتاں بیاہ کو رکھنے کی اجازت ہے۔ کب تک اکیلے رہتے۔ بس اللہ اچھا رکھو۔"

اس اچھا رکھنے کی چاہ میں وہ خود مٹّی ہوگئیں۔ ہر لمحہ دعائیں، ہر آن خدا سے گڑگڑاہٹ کہ بس 'اُنوں' کے پاس پہنچ جائیں ——— ایک طرف تو ہر ہر لمحہ کی یاد نے انہیں مار رکھا تھا، لیکن اس پر بھی اپنے سہاگن ہونے کا بے حد بھرپور احساس اور خیال تھا ——— حیدرآباد میں بنجارنیں اور وڈھر عورتیں سَروں پر ٹوکروں میں سُہاگ کا بے حد دل کش سامان، چُوڑیاں، مِسّی، موتی مالے اور بھی کئی طرح کی الا بلا لئے بیچنے نکلتیں۔ گلی میں جب بھی آواز آتی "سوئیاں پوت والی آئی ——— سوئیاں پوت لے لیو ———" تو اَمّی جھٹ دروازے میں جا کھڑی ہوتیں۔

"اَگے او سوئیاں پوت والی ——— آ ذرا مِسّی دے کو جا ———"

سوئیاں پوت والیاں۔ (وہ ان ہی ناموں سے پُکاری جاتیں) بڑے اطمینان سے پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتیں۔ ایک سے ایک بجوا اس چیز نکالتیں ——— سارے گھر کی لڑکیاں بالیاں، عورتیں اس ٹوکرے میں بے حد جاذبیت محسوس کرتیں۔ اکثر چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی ——— لیکن اَمّی صرف مِسّی لیتیں کہ یہ حیدرآباد دکن میں ہمیشہ سے خاص سُہاگنوں کے سنگار کی چیز مانی جاتی ہے۔ چھوٹا سا قد ——— رنگین

پاجامے کرتے۔ لمبے لمبے چُنے ہوئے دوپٹے —— گورا رنگ —— اس پرستی اُمّی بوڑھی ہونے پر بھی (یا شاید چونکہ میں چھوٹی سی تھی اس لئے وہ مجھے بوڑھی لگتی ہوں گی) بے حد پیاری تھیں —— ویسے وہ عمر میں ماموں ابا سے بھی شاید چھوٹی ہی ہوں گی، لیکن رشتہ سب انہیں اُمّی کا ہی لگاتے۔ دلاور میاں کہہ گئے تھے کہ پہلے خود جا کر پاکستان میں ٹھور ٹھکانا کرتا ہوں، پھر ایک ایک کر کے سب کو بلوا لوں گا —— اس آس میں کہ وعدے کے مطابق وہ لینے خود آئیں گے، اُمّی خود کو سدا بنا سنوار کر رکھتیں —— کیا پتہ کب اچانک آجائیں —— ہمیشہ دروازے کی طرف موبہہ کر کے بیٹھتیں۔

ایک دفعہ، بہت برس پہلے بیٹھے بیٹھے بہت شرما شرما کر ماموں ابا سے پوچھا "ہو بابوا کراچی کدھر ہے میاں؟"

ماموں ابا کسی کام میں مصروف تھے۔ اشارے سے بتا دیا —— 'اُدھر'، پھر زندگی بھر انہوں نے 'اُدھر' —— اس رُخ پر کبھی پاؤں پھیلائے نہ کبھی بیٹھیں ہی کی بچوں میں سے کسی نے یہ بات نوٹ کر لی اور پوچھا تو انہوں نے دھیرے سے کہا۔ "اُنوں کراچی میں رہتے ناماں۔ باوا بولے، اُس طرف کراچی ہے —— اب جدھر اُنوں رہتے ہیں اُدھر پیٹھ کیسے کر کو بیٹھوں؟ پاواں کیسے پھیلاؤں، شوہر کی بے ادبی ہوتی ناماں۔"

گھر بھر کے بچوں سے بے حد پیار کرتیں۔ جس سے لڑائی ہوتی، بہت محبت سے اپنے پاس بلا کر سمجھاتیں، مناتیں۔ اپنے پاس کے پیسوں میں سے دو دو پیسے نکال کر دیتیں اور لڑائی جھگڑے ختم کرا دیتیں —— بدلے میں بچوں سے صرف نمازوں کے بعد ایک ہی دعا مانگنے کی بھیک مانگتیں "یو لنا مولیٰ اُمّی کو اُنوں...."

اُن کے پاس دو چھوٹی چھوٹی تھیلیاں ان ہی کے ہاتھ کی سِلی ہوئی بہت اہتمام

سے صندوق میں رکھی رہتیں ــــــ ایک میں انہوں نے دو حالی روپے (نظامِ دکن کے زمانے کا ریاستی سکہ ـــــ) جوڑ رکھے تھے۔ دوسری میں ہندوستانی دو کلدار روپے تھے۔ بچوں کی کتنی بھی لڑائی ہو، اُن پیسوں کو وہ چھوتی بھی نہیں تھیں ــــــ پوچھنے پر کہتیں "اَئی کیا معلوم ماں اُنوں کب آجاتے ــــــ وخت بے وخت ہاتھ میں پیسہ رہنا اچھا، کرائے کو کام میں آئیں گا کراچی جاتے وخت۔"

بڑے بچے بتاتے ــــــ "امّی آپ آئی یا دمت کیا کیجئے وہ تو بھول بھی گئے ہوں گے آپ کو۔"

وہ مسکرا دیتیں ــــــ "بھولنے دیو۔ میں تو نئیں بھولی نا؟"

کوئی اور چھیڑتا، ارے امّی میرے ایک دوست پاکستان سے آئے تھے وہ اُنوں سے ملے تھے۔ کہہ رہے تھے 'خوب موٹے ہو گئے ہیں اُنوں' خوب خوش ہیں۔"

امّی کے جھرّیوں بھرے چہرے پر خوشی چھا جاتی "اَئی سچّی!" خوشی سے ان کا موںہہ کھل جاتا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان پر اتنی کم عمری میں بڑھاپا کیوں ایسے ٹوٹ کر برسا تھا۔ برہ کی مار انہیں ڈس گئی ہو گی، ورنہ ساٹھ ساٹھ برس کی عمر میں بھی لوگ یوں جھکے جھکے اور ٹوٹے ٹوٹے نئیں لگتے۔

لڑکیاں ضد کر کر کے انہیں جھولے پر بٹھا دیتیں ــــــ غم سہہ سہہ کر چہرہ جھرّیوں سے بھر گیا تھا، لیکن آواز میں ذرا بھی بوڑھا پن نہ آیا تھا۔

"امّی! گانا گائیے نا امّی ــــــ پلیز!"

لڑکیاں، لڑکے، عورتیں، باری باری پینگ دیتے، پہلے دھیرے دھیرے پھر ذرا اونچے سروں میں وہ ساون گانے لگتیں۔

اماں ساون میں منجے نہ بلوائیو تم
باوا سندیسے رکھو گے بھجوائیو تم

کس کے ساتھ آؤں گی کون بھجوائیں گا
پالکی میں منّے کون چڑھوائیں گا

کیسا کچا گھروندا بنائی تھی میں
بس اُجڑنے کو گُڑیا بسائی تھی میں

کیسی دُلہن بنی کیسی ہنستی پھری
جیسے خواباں کے باتاں تھیں شادی مری

میرے باوا کی ڈاڑھی میں ہیرے ٹکے
میرے اماں کے آنکھاں سے ندیاں بہے

جیسے ڈولی چڑھی ایسے ڈولا اُٹھے
مر کو سسرال سے تیرا پنڈا چھٹے

ایسے رو رو کے منجے بِداگی دِئے
غیر کو اپنی ساری کمائی دِئے

بڑی ممانی ساڑی سے آنسو پونچھ کر کہتیں: "اَگے، اس کو کوئی جھولے سے

تارو رے۔ کلیجہ ہلائے دیتی ہے موئی۔"
سارے میں سنّاٹا چھا جاتا۔ اور وہ درد بھری آواز گونجتی رہتی:

پھر نہ ساون میں مجھے بلائے کبھی
دِل مرا اِچ نہ جانے کو چاہے کبھی

بس 'اُنوں' میرے دِل کے سہارے بنے
چاند سورج بنے، دِل کے تارے بنے

مجھے دُنیا کی ساری خوشی مِل گئی
چاند کے سنگ سنگ چاندنی مل گئی

ہَن مری زندگی کو نظر لگ گئی
راستہ تکتے تکتے نظر تھک گئی

ہاتھ کی مہندی پھیکی پڑی بھی نہیں
مونہہ سے افشاں کی چمکی اڑی بھی نہیں

اونچے پینگاں پڑے جھولنا ٹوٹ گیا
مَیں کدھر وہ کدھر ساتھ اِچ چھوٹ گیا

امّاں باوا چُھٹے تھے تو یہ تھی خوشی
اُن کے خدموں میں کاٹوں گی یہ زِندگی

ایسی آندھی اُٹھی پتہ پتہ اُڑا
میرا پیہر گیا میرا میکہ چُھٹا

کیسا کچّا گھروندا بنائی تھی میَں
بس اُجڑنے کو بگیا بسائی تھی میَں

اَب نہ امّاں رہے اَب نہ باوا رہے
اک "اُنوں" اِچ اُمیدوں کا تارا رہے

لوگاں ساون کا پانی پچھانیں گے کیا
مِرے آنکھاں کے موتیاں ہیں ساون ہے کیا

ایک ساتھ امّی کے ساتھ سب ہی آنکھیں موتی برسانے لگتیں۔ (امّی امیر خسرو کا کوئی گیت گایا کرتی تھیں وہ مجھے یاد نہیں رہا۔ اب مجھے خُداوند تعالےٰ نے شاعری کا کچھ قرینہ اور سلیقہ دیا ہے تو ان کے حسبِ حال یہ گیت میَں نے دکھنی بولی میں، اپنے الفاظ میں نظم کیا ہے۔)

لوگوں نے تو ساون کے پانی کو سچ مچ نہیں پہچانا، جو دراصل امّی کی آنکھوں سے ٹپکنے والے موتی تھے، لیکن ان موتیوں نے اپنا تاوان خوب وصول کیا۔ روتے روتے

امّی کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ جوت کھو گئی، لیکن ان بے نور آنکھوں کو دروازے کی سمت یاد رہی ـــــ شاید آنے والا آجائے۔ آج ـــــ کل ـــــ پرسوں ـــــ ان کی بے نور آنکھیں اُدھر کو ہی دیکھتی رہتیں ـــــ سر، افشاں سے بھا ئیں ہلتا رہتا، جو دیکھتے دیکھتے اچانک برف سے بھر گیا تھا۔

پھر ہم نے گھر بدل دیا۔ بے نور آنکھوں کو سمتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ پرانے گھر میں امّی ٹٹول ٹٹول کر خود ہی پورے گھر میں گھوم لیتیں۔ پیشاب، پاخانے کو چلی جاتیں۔ نہانے کے لیے پانی رکھ دیا جاتا، تو اکیلی ہی چلی جاتیں۔ لیکن نئے گھر میں، میں اُن کی آنکھیں بن گئی۔

میں ہی ان کے سارے کام کرتی۔ کھلاتی پلاتی، ہاتھ پکڑ کر وضو کرانے لے جاتی ـــــ وہ مجھے لاکھ لاکھ دُعائیں دیتیں۔

"بیبا، جیسا تو میرا ساتھ دے رہی، اللہ تیرا ساتھ دیں گا ماں۔" ان کی آواز بھرا جاتی۔

"اب تو اُجاڑ آنسو بھی سُوکھ گئے!" وہ بڑے کرب سے کہتیں۔

"بس ایک بار پاکستان پہنچ جاتی۔"

"دونوں حکومتوں میں لڑائی ہو گئی ہے امّی۔" کیسی ناسمجھ تھی میں کہ اُن کے سامنے کہہ دیا ـــــ اب وہاں سے کوئی آسکتا ہے، نہ یہاں سے کوئی جا سکتا ہے۔"

وہ جو گھر بھر کے بچّوں کے جھگڑے، لڑائیاں چکاتی تھیں، ایک دن بڑی رازداری سے مجھ سے بولیں: "اب تو میں اندھی ہو گئی ماں۔ کہیں جا آ بھی نہیں سکتی۔ بیبا تو دونوں حکومتوں کو میرے پاس بلا دے نا ماں ـــــ میں دونوں کی لڑائی ختم کرا دیوں گی۔"

میں اندر ہی اندر روتی رہی۔ موہنہ سے ایک لفظ بھی نکالتی تو ان پر میرے

آنسو کھل جاتے۔

ماموں ابا، نانا جان کا حجِ بدل کرنے کے لئے جانے لگے تو سب سے مِل مِلاکر دُعائیں لینے، معافیاں مانگنے اَمّی کے پاس آئے۔ ماحول کے بوجھل پن کو دُور کرنے کی نیت سے چچا میاں ہنس کر بولے: "امّی، آپ کا دِل حج کو جانے کو نہیں چاہتا؟"

"میرا دِل؟" وہ اتنی دیر تک خاموش رہیں کہ سب سمجھے کہ وہ بات کا اگلا سِرا بھول گئی ہیں ——— بڑی دیر بعد وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولیں: "میرا دِل حج کرنے چاہتا کیسا نئیں بادا۔ پن میرا قبلہ، میرا کعبہ تو کراچی میں ہے ماں۔" پھر وہ جھکتے ہوئے انداز میں بولیں: "پہلے اُنوں سے مِل لیوں۔ یہ حج کر لیوں۔ پھر بڑا حج بھی کروں گی۔ ہور اُنوں کے ساتھ اِچ کروں گی۔ ماں تم لوگاں پڑھے لکھے لوگاں۔ مسئلے مسائل سے واقف، تم نا اتا بھی نئیں معلوم کی سُہاگن کا حج بغیر اُس کے سُہاگ کے پُورا نئیں ہوتا ——— غیر محرموں کے ساتھ کیسا تو بھی حج کو جاؤں ——— کیا معلوم اللہ کب راتے کھول دے ہور اُنوں ....."

مرتے وقت اَمّی نے ٹٹول ٹٹول کر میرے چہرے پر میری آنکھیں محسوس کیں ڈرتے ابھرتے لمحے میں اٹک اٹک کر بولیں:

"یہ آنکھاں تیرے آنکھاں نئیں بیبا بیٹی۔ یہ میرے اِچ آنکھاں ہیں ——— اب ان اِچ سے میں دُنیا دیکھتی تھی۔ تیرے کو کیا بتاؤں۔ تو خود پڑھی لکھی ہے ماں۔ اپنے مذہب میں کسی مجبوری سے کوئی خود حج نئیں کر سکا تو دوسرا اُس کے واسطے حج کر دیتا اس کو حج بدل بولتے نا ——— میں کراچی نئیں جا سکی ——— اُنوں سے نئیں مِل سکی۔ پن اللہ تیرے کو اِتا پیسہ دیا کی تو اپنا خرچہ خود برداشت کر سکی تو، میری ماں، میرے اُنوں سے ایک بار جا کو ضرور مِلنا۔ اپنی آنکھاں سے اُنوں کو دیکھنا۔ میں یہ سمجھ لیوں گی کی میں

حج دیکھی، اُنوں کو تو نئیں، میں اِچ دیکھی —— ہور اُنوں کو اتّی بات یاد دے پتا دینا کی میں عمر بھر خالی تمہارا اِچ انتظار کی —— تمہارا اِچ رستہ دیکھی۔ میری کوئی بھی غلطی ہوئی ہوئیں گی تو معاف کردیو، کیوں کی حج کو جانے والے، حج کرنے والے دِل میں کپٹ نئیں پالتے۔ ہور یہ بھی بول دینا کی خیر تم نے تو میرے کو کوئی بھی دُکھ، کوئی بھی غم، کوئی بھی تکلیف دِئے اِچ نئیں جو میں معاف کروں —— بس ایک انتظار کا کانٹا تھا، سو وہ بھی ختم کیا دِئے، وہ تو میری تقدیر تھی —— یہ سوب باتاں بولنا بیبا —— نئیں تو حشر میں میں تیرا —— بیبا بیٹی، ایکچ بار —— بس ایکچ بار —— کراچی ....."

کتنے سارے سال گزر گئے ہیں —— میں آج تک کراچی نہیں جا سکی —— بمبئی سے کراچی دو گھنٹے کی ہوائی مسافت ہے۔ کراچی میں میری دو سگی ماں جائی بہنیں بھی ہیں —— کتنے سارے برس بیت گئے ہیں۔ جوان ڈالیوں کی طرح تنے ہوئے وہ جسم اب بوڑھی شاخوں کی طرح خمیدہ ہو چکے ہوں گے —— آنکھوں پر چشمے لگ چکے ہوں گے —— سیاہ بالوں پر وقت نے اپنے اَن دیکھے قدموں کی سفید گرد بچھادی ہوگی —— سر ٹکا کر رونے کے لئے وہ کندھے مجھے اس وقت بھی یاد آئے جب میرا بھائی کینسر سے مَرا۔ وہ کندھے میں نے اُس وقت بھی ڈھونڈے جب میرا جوان ہیرے جیسا دیور دولہا بننے سے دس دن قبل پیوندِ زمین ہوگیا —— مگر ان دُوریوں کو میں آج تک نہیں پاٹ سکی، جو بہنوں کو بہنوں سے، ماؤں کو بیٹوں سے، بھائیوں کو بھائیوں سے، اور سب سے بڑھ کر نعوذ باللہ خُدا کی طرح چاہنے والی بیویوں کو اپنے شوہروں سے بچھڑا دیتی ہیں۔

اے ربِّ کریم! اے ارحم الرّحمین! زندگی میں مجھے اتنا اثاثہ ضرور دینا کہ ایک بار کراچی جاکر میں حجِ بدل کی یہ سعادت حاصل کرسکوں۔

وہ موضوع بدلنے کی خاطر جھٹ اُسے کام بتانا شروع کردیتے۔

"ہتھوڑی کہاں رکھا تھا؟ میرے کو دِکھ رئی نئیں۔"

اصل مزہ نواب صاحب اور پاشا کے کھانے کے وقت آتا۔ اللہ جانے کیا بات تھی، پاشا مخمل پر چلتیں، سونے پر سوتیں، اشرفیوں میں کھیلتیں لیکن چھوٹی سے چھوٹی بات کی خبر رکھتیں۔ ہر چیز پر اُن کی نظر رہتی —— اتنے سارے نوکروں چاکروں کے باوجود نواب صاحب کے لئے کھانا خود ہی نکالتیں اور کھلاتیں۔ کھانے کے کمرے کی اپنی ہی شان تھی۔ یہاں بھی اکہرے مخملیں قالین بچھے رہتے، لیکن نیچے گدّے نہیں ہوتے تھے، کیوں کہ کھانے کی چوکیاں ڈگمگانے لگتی تھیں —— کمرے کے بیچوں بیچ قالین پر سفید برف کی طرح چاندنی بچھی ہوتی —— چاندنی پر چاندی کی چوکیاں۔ چوکیوں پر سُرخ سُرخ دَسترخوان —— کھانا فرش پر بیٹھ کر کھایا جاتا، لیکن لگایا جاتا چوکیوں پر۔ رزق کے اَدب اور احترام کی نیت سے کھانا چوکیوں پر ہوتا اور کھانے والے نیچے بیٹھتے۔

کھانا شروع ہونے سے پہلے ایک ساگوان کی بڑی سی چوکی پر ساری پکی ہوئی ہانڈیاں لاکر سجادی جاتیں۔ پاس ہی ایک چوہرے مخمل کی صافی لاکر چاندی کے طشت میں رکھ دی جاتی کہ پاشا جب ہانڈیوں کے ڈھکن اُٹھائیں تو اس مخمل کی صافی سے پکڑ کر اُٹھائیں اور ہاتھ میں جلن یا تکلیف نہ ہو۔ ایک بار مغلانی بی کی غلطی سے چوہری تہہ کی بجائے اکہرے مخمل کی صافی رکھ دی گئی تھی —— پاشا کا ہاتھ ڈھکن اُٹھانے میں اکہری تہہ میں سے ایسا جلا کہ آبلہ پڑ گیا۔ پاشا سب سے پہلے صافی سے ڈھکن اُٹھا کر چمچہ سنبھالتیں اور ہانڈی میں چلاتی ہوئی محاسبہ کرتی جاتیں۔ ماما بی سر جھکائے جواب دیے جاتیں۔

"آج کتے مُرغیاں ہکائے تھے؟"

"جی پاشا، تین۔"

ضرور ایک حویلی تھی۔ دیکھونا، دیواریں وغیرہ گر گئی ہیں —— کہیں کہیں مٹی گارے کے ڈھیر بھی نظر آرہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے یہاں جھونپڑیاں بھی کھڑی کرلی ہیں، لیکن میں غلطی نہیں کر رہا ہوں، جگہ وہی ہے، بالکل وہی۔"

ایک بوڑھا پھوس آدمی آگے بڑھا۔

"بابا شا، آپ حویلی میں رہنے والوں کا نام تو یاد رکھے ہوئیں گے؟ نام بتاتے تو شاید کچھ پتہ ٹھکانا ملے۔"

"نواب شبیر یار جنگ۔" نووارد بڑی مشکل سے بول سکا۔

"اچھا! اچھا —— وہ اُنوں شبیر یار جنگ؟ ہو باشا، میرے کو یاد آگیا دیکھو، آپ ذرا یہ دو تین جھونپڑیاں چھوڑ کر آگے نکل کو جائیں گے تو ایک —— جھونپڑے میں اُنوں کے بچے کھچے گھر والے مِل جائیں گے ——"

"بچے کھچے؟" نووارد نے زیرِ لب بڑے دُکھ سے دُہرایا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا بوڑھے کے بتائے ہوئے راستے پر بڑھنے لگا۔

کچرے کے ڈھیر، گھورے، مٹی اینٹوں، پھٹے پُرانے چیتھڑوں سے بچتا بچاتا وہ ایک بوسیدہ سے جھونپڑے کے سامنے رُک گیا۔

سامنے ہی دھوپ میں ایک بوڑھی عورت پیوند لگی ساڑی اور حیدر آبادی کُرتا پہنے، بڑیاں سُکھا رہی تھی۔ گلی کے کُتے، چڑیاں، کوئے موہنہ نہ ماریں، اس لئے ایک ڈنڈے کو بار بار پٹخ دیتی تھی۔

ایک گولا سا نووارد کے حلق میں آکر پھنس گیا۔ "نہیں نہیں —— میرے خدا یہ نہیں ہو سکتا!" وہ اپنے آپ سے بولا۔

بچوں اور بڑوں کا ایک غول اسے ڈر ڈر کر اب دُور ہی سے دیکھ رہا تھا —— نزدیک آنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ شاید اس کے شاندار سراپا اور اعلیٰ، قیمتی

سوٹ کی وجہ سے۔

جھونپڑی سے ایک سوکھی ماری غریب عورت باہر نکلی۔

"خالہ، بڑیاں سوکھ گئے ہوئیں گے تو۔۔۔۔"

اچانک سامنے کھڑے نووارد کو دیکھ کر وہ جھجک سی گئی —— اجنبی نے بڑی شائستگی اور نرمی سے پوچھا: "آپ مجھے شبیر یار جنگ کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں؟"

بڑیاں سکھاتی ہوئی بڑھیا ایک دم ڈر سی گئی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی:

"میں سچی بولتیوں، اب ہمارے کنے کچھ بھی نئیں رہیا۔ یقین نئیں آتا تو یہ جھونپڑے میں جا کو خود دیکھ لیو آپ۔"

اجنبی کا دل اتھل پتھل ہو گیا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں بی۔ میں آپ کا کوئی قرض خواہ نہیں ہوں —— میں

میں تو نواب صاحب کے ایک دوست کا بیٹا ہوں —— بہت دن بعد حیدرآباد آنا ہوا تو سوچا کہ ملتا چلوں —— آپ مجھے اُن کا کچھ حال احوال بتا سکتی ہیں؟"

بڑھیا نے ہاتھ کا ڈنڈا زمین پر رکھا۔ کمر پہ ہاتھ کا زور لگا کر بڑی مشکل سے سیدھی ہوئی اور جھکی جھکی، ہانپتی ہوئی نووارد کے پاس آ کر رک گئی۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی: "بولو بادشا، کیا حال پوچھنا چاہتے آپ؟" "نواب صاحب تو مر کو سالوں گذر گئے۔ میں اُنوں کی اُجاڑ بد نصیب بیوہ ہوں۔۔۔۔"

سَر سَر کرتی، غموں سے بوجھل، آنسوؤں سے گیلی، دل کو کاٹ دینے والی ہوائیں جانے کہاں سے آئیں اور قطرہ قطرہ لہو تک کا خراج مانگنے لگیں۔

"نہیں بی نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔" نووارد نے لوگوں کا خیال کیے بغیر بڑھیا کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

بڑھیا حیرت سے اس مہربان اجنبی کو دیکھ رہی تھی ـــــ اس کے دونوں ٹھٹھرے مارے ہاتھ اجنبی کے ہاتھوں میں تھے ـــــ زمانے کے بے رحم ہتھوڑوں نے ان ہاتھوں کو کیسا کچلا ہوگا! ہڈی پر صرف چمڑا منڈھا رہ گیا تھا اور بے پناہ نسوں کا جال۔ وہ ہاتھ جو صرف مخمل کو ہی چھوتے تھے!

ذہن پر پرانی یادیں ابھرتی ہیں تو کسی پروجیکٹر کی ضرورت نہیں پڑتی کہ اس فلم کو چلائے ـــــ رُکے بغیر کیسی کیسی دل خراش یادیں اس پردے پر ابھرتی چلی آتی ہیں۔

چاؤش، باپ کا چاؤس بیٹا ـــ مشکور اللہ۔

مدتوں پہلے کا حیدرآباد دکن ـــــ

مشکوراللہ ان دنوں مشکل سے دس گیارہ سال کا ہوگا۔ اس کا باپ چاؤش اکبراللہ نواب شبیر یار جنگ کی ڈیوڑھی پر دربان تھا ـــــ مشکوراللہ کو کبھی ڈیوڑھی پر جانے کی ضرورت نہ پڑی، نہ کبھی باپ ہی اسے ساتھ لے گیا ـــــ ہاں ڈیوڑھی کی باتیں وہ بیٹے کو بہت سنایا کرتا تھا ـــــ خاص طور سے مردانے کی اور نواب صاحب کی باتیں ـــــ اس کا واسطہ دربان ہونے کے ناطے ظاہر ہے مردانے سے ہی زیادہ پڑتا تھا۔

پھر ایک دن ڈیوڑھی میں کسی کی شادی کی دھوم مچی، اور اکبراللہ اپنے سب گھر والوں کو ہی شادی میں لے گیا۔ مشکور کو وہ سارا ماحول بے حد پسند آیا اور سب سے زیادہ پسند تو اسے نواب صاحب آئے۔ اکبر کے گھر والوں سے وہ بے حد محبت سے ملے۔ مشکور کو دیکھ کر اس کے باپ سے بولے: "سدی بھئی، یہ چھوکرا تو تم ہم کو دے دیو ـــــ"

"سرکار ـــــ"، اکبر خوش ہو کر بولا: "آپ کا اِچ ہے ـــــ لے لیو۔"

"ہم مذاخ نئیں کر رئے۔ پھر ہم اس کی تم کو دینے والے نہیں۔"

اکبر مارے خوشی کے دُہرا ہو کر بولا ۔۔۔ "سرکار، آپ کے خدموں میں رہے گا، اس سے بڑھ کر اس کی خوش قسمتی کیا ہوئیں گی؟ دیا، سرکار میں دیا۔"

"ہور تیرے بارکس محلّے والے سارے چاؤشاں ستیاں یو ماں مارنئے تو؟" نواب صاحب ہنسے۔

شاہ علی بنڈہ سے آگے محلّہ بارکس تھا، جو یقیناً کسی زمانے میں فوجی بیرکس رہا ہوگا۔ لیکن بگڑتے بگڑتے وہ بارکس ہو گیا تھا۔ عرب سے آئے ہوئے خاندان کے خاندان وہاں آباد تھے۔ جو سب چاؤش یا سیدی کہلاتے تھے۔ اکثر چاؤش مرد نوابوں کی ڈیوڑھیوں اور حویلیوں میں دربانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ کالے چمکدار سیاہ رنگ۔ گھونگریالے بال۔ موٹے موٹے ہونٹ چمکیلی آنکھیں۔ اپنے سراپا اور حلیے سے وہ الگ سے پہچانے جاتے۔ بہادری اور جاں نثاری میں بے مثال۔ لڑنے مرنے پر ہمیشہ کمربستہ۔ حق تلفی کو برداشت نہ کر پاتے۔

اکبر مسکرا کر بولا: "سرکار، یو ماں کون مارے گا؟ وہاں تو سب اس بات کی تاک میں رہتے کی کیا کبی کی آپ جیسے بادشاہ لوگاں کی غلامی کا موقع ملتا یوں کے۔"

"مگر بھئی نوکری چاکری کی بات ہور ہے، ہم تو اس کو عمر بھر کے واسطے سے لینا کر کے لے رئے۔"

"آپ فکر نکو کرو، سرکار، میں باپ ہوں نا۔ میں اچ راضی تو کون کیا بولنے چلا؟"

پھر اس نے برابر کھڑی ہوئی سر بھر کئے دوپٹہ اوڑھی ہوئی اپنی بیوی سے عربی میں کچھ پوچھا اور خوش ہو کر بولا: "سرکار، وہ بھی بول رئی کی میں تو اپنا بچہ آپ کو دی۔"

نواب صاحب کو وہ بچہ ایسا بھایا کہ اسے اپنا سایہ بنا لیا ـــــــ خُدا کا کرنا، ایک دِن اکبر بندوق صاف کر رہا تھا، بندوق بھری ہوئی تھی۔ گولی چل گئی اور سیدھی اُس کے دِل میں پیوست ہو گئی۔ نواب صاحب نے سوچا بھی نہ تھا کہ جس بچے کو محض وہ دِل بہلانے کی خاطر لے رہے ہیں، یتیم بن کر ان کی اپنی ذمہ داری بن کر رہ جائے گا ـــــــ مشکور رے انہیں ویسے ہی بہت پیارا تھا، یتیم بن کر تو وہ ان کے دل کا ٹکڑا بن گیا۔ نیبوں جیلی ماں آتی تو دِل میں ٹھنڈک لے کر جاتی۔

نواب صاحب، حیدرآباد دکن کے عام نوابوں کے برخلاف کسی اور ہی چیز کے دیوانے تھے۔ حویلی میں شادی، سال گرہ، ختنہ، بسم اللہ کی رسموں اور تقریبوں میں مجرے گانے، بجانے ضرور ہوتے۔ لیکن نواب صاحب کی دِل چسپی ان محفلوں سے بس واجبی ہی ہوتی۔ شراب کو بھی وہ ہاتھ نہ لگاتے۔ ان کی ساری دل چسپی صرف موٹروں سے تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑنے والے، انگریزوں کی لائی ہوئی چیزوں کا بائیکاٹ کرتے۔ لیکن انگریز بعض چیزیں ایسی بھی لا چکا تھا جس کا نشہ شراب سے کسی طور کم نہ تھا۔ حیدرآباد میں جس وقت لوگوں نے موٹر کا نام بھی نہ سنا ہوگا، شبیر یار جنگ کے دادا موٹر میں بیٹھ چکے تھے۔ دادا کا شوق بیٹے کو ورثے میں ملا اور پوتے شبیر یار جنگ تو اس عشق میں سر سے پاؤں تک ڈوب چکے تھے۔

حویلی کے پچھلے بڑے سے کمپاؤنڈ میں، جہاں آم کے درختوں کا چھتنار سایہ پھیلا رہتا تھا، یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا کہ موٹر کے نیچے نواب شبیر یار جنگ لیٹے ہوتے ہیں اور یہ مشکورا دوڑ دوڑ کر احکام بجا لا رہا ہے۔ دوسرے نوکر دور سے شرما کر مسکرا کر دیکھتے رہتے۔

نواب صاحب بولتے رہتے:

"اَبے یہ پانا نئیں، وہ بڑا والا پانا دے۔"

"اے مار تو پکڑا ذرا میرے کو"
"گریس دے جلدی سے"
"ہاتھاں میں پھرتی رکھ۔ نئیں تو میرے اتّا اچھا ڈرائیور ہور مکینک نئیں بن سکے گا"

نواب صاحب کو موٹر میں بیٹھنے، چلانا، گھومنے پھرنے سے بھی زیادہ موٹریں کھول کر ڈالنے کا شوق تھا —— نئی سے نئی موٹر لیتے، اُس کو پورا کھول ڈالتے مگر پھر اسمبل کرنا نہ آتا۔ یہ نہ سوجھتا کہ کون سا پرزہ کہاں سے نکالا تھا، کہاں لگانا ہے۔ گودام میں کئی ایسی بے کار موٹریں بھری پڑی تھیں۔ پھر بھی شوق پورا نہ ہوتا۔ سدا موٹر کے نیچے پائے جاتے۔ ان کے ایک بھتیجے نے جغرافیہ کا اس طرح سبق سنایا ہے حویلی والے سن سن کر خوب ہنسے :

"سنترے ناگپور میں پائے جاتے ہیں"
"شریفے شاد نگر میں پائے جاتے ہیں"
"کپاس برار میں پائی جاتی ہے"
"آئینے بلجیم میں پائے جاتے ہیں۔
"اور چچا میاں موٹر کے نیچے پائے جاتے ہیں"

نواب صاحب کا سچ مچ یہی حال تھا۔ بس موٹر کے نیچے پڑے ہیں اور جملہ مطالبات وہیں پورے ہو رہے ہیں۔

"ابے شکورے!"
"جی سرکار!"
"ذرا سی چائے بنوا کے تو لا باورچی خانے سے"
وہ لپکتا تو کہتے "ہور سن، تھوڑے کباباں بھی ——"

"جی ہو سرکار ـــــ"

وہ پھر لپکتا تو نواب صاحب پھر چلّاتے ـــــ "ہور سُن، ذرا پاشا سے بول کہ دو تین پاناں بھی بنوا کو لے آنا۔"

بس 'پاشا'، کا نام سُنتے ہی مشکورے کی میت اُٹھ جاتی ـــــ نواب صاحب بجھ جاتے۔ مُسکرا کر کہتے "تُو ڈرتا کائے کو رے؟ کیا اُنوں شیرنی ہیں کی تیرے کو کھا جائیں گے۔ تو سب سے پہلے اُنوں کو سلام کر دیا کر۔"

وہ مُسمُسی شکل بنا کر کہتا "سلاماں تو میں بہوت کرتا، پن پاشا بولتے: سلام میں اِچ پڑے تیرے۔"

"اوہہ! اب جاتا کے۔ بہوت چائے کی یاد آرئی۔"

شکورا دھیرے دھیرے زنان خانے میں جاتا اور اس پر وہ دُنیائیں ـــــ پھولوں بھری، خُوشبو بھری، خوابوں بھری دُنیائیں مُنکشف ہوتی شروع ہو جاتیں جن کا ذکر وہ اُردو کی پریوں کی کہانیوں والی کتاب میں پڑھتا تھا۔

یہاں سے وہاں تک لمبے چوڑے کمرے میں دیوار تا دیوار قالین بچھا ہوتا ـــــ قالین جو چلنے میں بالشت بالشت اندر دھنستا، کیوں کہ قالین کے نیچے سنبل کی ریشمیں روئی بھرے گدّے بچھے ہوتے۔ پھر ان گدّوں پر قالین اور پھر قالین کے اوپر مخملی چاندنیاں نواب صاحب کو اُس نے کہتے سُنا تھا: "ہم نئیں چاہتے کہ ہمارے پاشا کے پاواں کھردرے قالین پو پڑیں ـــــ"

اس نرم قالین اور مخملی چاندنیوں سے ڈھکے فرش پر دیواروں سے نرم گدگدے تکیے لگے رہتے۔ اُسی کمرے میں ایک طرف پاشا کا لمبا چوڑا سونے کا چھپر کھٹ تھا، جس پر انگریزی ریشم کے ملائم گدّے، تکیے تھے۔ سنہرے جھم جھماتے چھپر کھٹ کو دیکھ کر وہ یہی سمجھتا کہ سنہری پنّی چپکا دی گئی ہے ـــــ ایک دِن بچوں میں کھیلتے ہوئے بادشاہ کا تاج بنانے

کی ضرورت پڑی تو وہ بولا : "اِتّی جا کو ذرا سی پَنّی نوچ کو لا تا دَوں"۔
مگر جب لاکھ نوچنے پر بھی پَنّی ہاتھ میں نہیں آئی تو وہ نواب صاحب کے پاس پہنچا۔

"سرکار، وہ اُتّے پلنگ ہے نا، اس کی پَنّی ہاتھ کو نئیں آتی ــــــ"
نواب صاحب جی بھر کر ہنسے۔ "اَبے اُلّو کی دُم، وہ سونے کا ہے"۔
"سونا کیا ہوتا، سرکار؟" وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔
"کیا بتاؤں بیٹا تیرے کو، سونا کیا ہوتا۔ انسان کو دوزخ میں پہنچا دیتا، سونا وہ ہوتا ــــــ"

سونے چاندی کا راز اس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا، لیکن پاشا کے کمرے کا سحر ڈرائے رکھنے کے باوجود اسے وہاں جانے پر مجبور کرتا ــــــ وہ جب بھی سرکار کا کوئی سندیسہ لے کر پاشا کے پاس جاتا، 'پاپوش گیر' پر جو مخمل کی چار پانچ تہیں جما کر بطورِ خاص پاشا کے لیے حویلی کے درزی سے سلوایا گیا تھا، دیر تک پاؤں رگڑتا، تاکہ قالین پر بچھی مخملی چاندنی میلی نہ ہو، اور بے حد احتیاط سے پاؤں جما جما کر چلتا، پھر بھی پاشا کے پاس پہنچتے پہنچتے دھڑا دھڑ کئی کئی بار گرتا، کیوں کہ بالشت بالشت اندر دھنستے والے قالین پر اس کے قدم جم ہی نہ پاتے۔

"نکل موئے! بار بار کہے کو اپنے گندے سارے پاواں سے میرا کمرہ گندہ کر دیا حرام خور!"

وہ چلّائے جاتیں، مگر وہ بار بار ڈگمگاتا اور گرتا۔ یوں گرنے میں اُسے مزہ بھی آتا کہ سارا جسم نرم نرم قالینوں میں ابھر ابھر کر اوپر آتا، نیچے جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ کبھی پاشا کہیں مہمان جائیں اور کمرہ مقفل کرنا بھول جائیں تو وہ خوب لوٹیں لگائے۔ لیکن پاشا ہر لحاظ سے چوکس تھیں۔ اپنے مطلب کی کوئی بات نہ بھولتیں ــــــ کسی خطا کو معاف

نہ کرتیں۔ نواب صاحب کا مزاج اس کے بالکل برعکس تھا۔

گاڑی کے نیچے پڑے پڑے اچانک اُنہیں ٹائم یاد آتا ـــــ گھڑی دیکھتے۔

"ارے دو بج گئے! ہور یہ خیال اچ نئیں رہا کی کھاتے کا وقت تک گیا! جا پہلے تو کھا کو آجا۔"

وہ چلنے لگتا تو پوچھتے: "کیا پکا ہے بے؟"

"جی سرکار ـــــ؟ کیا پکا؟ ـــــ ہو ـــــ ہم لوگاں کے واسطے کھٹی دال۔ موٹے چاول کا کھانا۔ ہور آپ...."

"بول بول، ہمارے واسطے ـــــ؟"

"جی آپ باشا لوگاں کے واسطے مرغی، بگھارے بینگن۔ ہور خوشبو والے چاول کا کھانا ہور...."

"سن۔" وہ اسے اشارے سے قریب بلاتے۔

"جاکو مرغی کی ایک ٹانگ چرا کو کھالے۔" وہ دھیرے سے کہتے۔

شکورا احتجاج کرتا: "سرکار، آپ میرے کو چوری سکھارتے!"

"ابے چوری کے بچے، جاتا ہے کہ نئیں؟"

وہ ڈر کے مارے جانے لگتا تو کہتے "دیکھ، ماماجی کی آنکھ بچا کو۔"

وہ جب کھانا کھا کر آجاتا تو بے حد خوش ہو کر پوچھتے "کیسی تھی مرغی؟"

وہ مرغی کے اوصاف گنانے بیٹھتا تو چلا کر اُسے ڈانٹتے۔ "اب ہم باشا کے سامنے اُنوں سوال جواب کریں گے ہور تیرے سے پوچھیں گے تو واخی خبول دیں گا کہ میں مرغی کھایا تھا؟ ابے مرغی کے، یاد رکھ کچی بولا تو...."

شکورا قسماتا: "سرکار، آپ میرے کو جھوٹ بولنا بھی سکھارے۔ مولبی صاحب تو بولتے کی چوری کرنا، جھوٹ بولنا بہوت بڑے بڑے گناہ ہیں۔"

پُل صراط

لمبی سی سفید، انتہائی شان دار اور چمکیلی مرسڈیز ایک نرم سے ہچکولے کے ساتھ رُک گئی ——

کار سے ایک بے حد باوقار اور وجیہہ شخص اُترا —— اپنی آنکھوں سے سُنہری فریم کے گاگلز اُتار کر ہاتھوں میں گھماتے ہوئے وہ متجسّس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

کار کے آس پاس کئی بچے، بڑے آنکھوں میں حیرت اور اشتیاق لیے آ کھڑے ہوئے۔ اس نے ایک آدمی سے نرمی سے پوچھا "پہلے یہاں ایک بڑی شان دار حویلی ہوا کرتی تھی، بھائی —— کچھ پتہ ہے اس کے بارے میں؟"

وہ آدمی آگے بڑھ کر گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا:

"پاشا، آپ کون سی حویلی کی بات کرئے؟ پُرانا حیدرآباد اُجڑے ویسا ہی ہوگیا۔ نوے نوے عمارتاں بن گئے —— پُرانے تو مٹی میں مِل گئے۔

نووارد نے بے چینی سے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی "نہیں بھائی، یہاں پہلے

پھر وہ چمچہ گھماتیں : ایوتین ؟ پھر چھٹا مگاں ہونا تھانا —— ایک کیا ہوئی —— ؟

وہ مڑ کر نواب صاحب کی طرف دیکھتیں —— وہ ان کی نگاہوں کی مار سے بچنے کی خاطر رکابی پر چمچے سے جل ترنگ بجانا شروع کر دیتے، کیوں کہ کھانا تو ابھی پاشا کی تحویل میں ہی ہوتا۔ وہ ان کی بے نیازی دیکھ کر چلاتیں "کھلا رئے ہوں گے اس حرام خور کو۔"

"اب پاشا اپنے بچے کھائے سو گیا، اُتنے کھایا سو گیا ——" وہ نرمی سے کہتے۔

"مطلب کھلائے نا اس کو —— ؟ اب کھایا تو سو کھایا، اب کھائیں گا تو انگلی ڈال کرتے کرا کرنہ نکالی تو لونا ——"

"پاشا اُنے بے چارہ یتیم ہو گیا نا —— اللہ میاں اپنے پر ذمہ داری ڈالے سو نبھانا اِچ پڑتا نا۔"

"ابھی وہ تو میں مانی کی اُتے یتیم ہے۔ پن ساری حویلی کے نوکراں اِچ یتیم ہو گئے کیا ؟ جس کو دیکھو اس کو ٹھساتے، بھراتے۔" پھر وہ پانی کا گلاس تھامے کھڑے شکور کو دیکھ کر بھن بھنا کر کہتیں : "ہور یہ حرام کا جنا تو خوب راج رچ ریا ——"

اور وہ بکتے جھکتے کھانا اتارنا شروع کرتیں۔ چاندی کے بڑے بڑے کٹوروں اور رکابیوں میں قورمے، مرغے، بریانی، میٹھے —— ایک سے ایک نعمت۔ یہاں سے وہاں تک رشتہ داروں، مہمانوں سے بھری پڑی چوکیاں۔ پھر ماما بی کو تنبیہہ ہوتی : "اَب ے بنڈیا پیکا کو نعمت خانے میں ذرا بند کر کے رکھ دینا —— بول دی میں۔"

لیکن نواب صاحب اس قسم کی باتوں کے عادی ہو چکے تھے ـــــ موٹر کے نیچے پڑے پڑے وہ لیکچر بھی جھاڑا کرتے :

"ابے شکورے، تو اپنے پاشا کی باتوں کا بُرا تو نہیں مانتا نا؟"

وہ کچھ حیص بیص میں جواب دیتے دیتے رہ جاتا۔

"بُرا نکو مانا کر۔ بُرا مانے کرکے لیے تو اپنی ارچ صحت خراب ہو جاتی، ہور سب سے بڑی نعمت اللہ میاں انسانوں کو صحت دئے ـــــ معلوم؟ بس ہنستے رہنا۔ اب ہنس!"

وہ سوکھا مونہہ بنا کر کہتا: "ہنسی نہیں آرئی۔"

"اچھا، تو پھر میں گانا گاتاؤں۔" نواب صاحب بے حد کھونڈا گانا گاتے تھے۔ حویلی میں کبھی مجرے ہوتے یا قوالی ہوتی، گانے والے تو گا کر چلے جاتے، اور نواب صاحب ان غزلوں کی مٹی پلید کرتے رہتے۔ شکورا چھوٹا سا تھا، لیکن کھلم کھلا کہتا: "سرکار، آپ بہوت ہی بہوت خراب گاتے۔"

جب موٹر کے نیچے اپنی ترنگ میں آکر وہ کچھ گانا شروع کرتے، تو شکورا ہنستے ہنستے لال پڑ جاتا۔

اس کی ہنسی اور خوشی کا وہ کس قدر خیال رکھتے!

نیا کرتا پہن کر موٹر کے نیچے لیٹتے اور خواہ مخواہ باہر گھٹنے گھٹنے مسکا دیتے۔ اسی پر بس نہ کرتے، اس کو حکم دیتے: اگے شکورے۔ مار توڑے کرتے میں ایک کھونچا تو لگا ـــــ"

"وہ کائے کو سرکار؟"

وہ کھونچا لگاتا تو پھر وہیں کھڑے کھڑے نیا کرتا اس کے حوالے کر دیتے۔

"اب یہ پھٹا ہوا کرتا میرے کس کام کا؟ جا، اپنی ماں سے بول کے اس کو

چھوٹا کروائے تو پہن لے۔"

پاشا ننگا بھوت بنا انہیں آتا دکھتیں تو چلاتیں: "ہو ہو ـــــ میں بھجی نئیں کیا۔ اس کو دیا۔ بول کے کھو بچے لگا لیتے۔ وہ مردار سیتی بیٹھی کھتی تو میں دیکھی نئیں کیا؟"

کچھ دن سے یہ کہہ کر کہ اکیلی بیوہ کیا کرے گی، کہاں رہے گی، کیا کھائے گی، انہوں نے شکورے کی ماں کو بھی حویلی میں ہی نوکر خانے میں ایک کمرہ دے دیا تھا۔

بے شمار نوکر تھے ـــــ بے پناہ طویل و عریض حویلی کتنے ہی کام کرنے والے لیکن نواب صاحب کی شکورے کے بغیر روٹی ہضم نہ ہوتی۔ وہ بھی ان سے حد درجہ محبت کرتا تھا۔ ان سے ڈرتا بھی تھا۔ مگر ان کو دوست بھی سمجھتا تھا۔ وہ خود اسے دوستوں جیسا ہی رکھتے تھے۔

"شکورے، دیکھ کیسے بڑے بڑے کیریاں لٹک رئے۔ توڑتا کیا ایک؟"

"کائے کے واسطے؟" وہ حیرت سے پوچھتا۔

"اپے کھائیں گے ـــــ ہور کیا؟"

"نکو ـــــ" وہ ایک ہی لفظ میں فیصلہ کر دیتا ـــــ

"اَبے کیوں بے، نکو کیوں؟ جوتے کھاتا؟"

"ہور گلے وتے آ گئے تو؟ چپ آپ بیمار نکو پڑو ـــــ"

پھر وہ ان کی توجہ بٹانے کو کہتا " ریڈی ایٹر میں پانی ڈالوں، سرکار؟"

وہ اسے بے حد غصے سے دیکھتے، پھر مسکرا کر کہتے "تو اتنا مخل مند کیسا ہو گیا رے شکورے؟ میں اتنا مخل مند کیوں نئیں ہوں؟"

شکورا کچھ بھانپ جاتا کہ اس سے کہیں نہ کہیں غلطی ہو گئی ہے۔ نواب صاحب سر پیٹ کر کہتے "تیرے جیسے دو تین ماتحت مل گئے تو میں تو موٹروں کا کارخانہ

کھول لیوں۔ ابے پاگل تو ریڈی ریٹر میں پانی ڈالیں گا تو امین (پولیس) آکو تیرے کو پکڑ لے جائیں گا —— سمجھا؟"

"پھر آپ میرے کو گاڑی کے سوب باتاں سِکھاؤ نا، سرکار۔ میں بڑا ہو کو آپ کی موٹر چلاؤں گا۔"

پاشا تو اسے گاڑیوں کے آس پاس دیکھ کر ہی چلانے، کاٹنے دوڑتیں۔ ایک دن اس کو موٹر کا ہارن بجانے کا شوق آیا۔ نواب صاحب اس وقت اندر تھے اور شامتِ اعمال سے پاشا باہر۔ اُدھر ہارن سے پوں کی آواز نکلی اور اِدھر پاشا کی اس قدر نفرت اور زہر بھری "ہوں" کے ڈر کے مارے جیسے اس کا دم ہی تو نکل گیا۔ وہ زور سے ڈانٹ دیتیں تو شاید اتنا بُرا نہ لگتا، لیکن اُس نفرت بھری "ہوں" نے مدتوں اس کے ذہن کو پراگندہ رکھا۔

اُدھر نواب صاحب تھے کہ وہ جب چھوٹا سا ہی تھا تو کبھی برابر میں بٹھا کر اسے سمجھاتے: "دیکھ، اسٹرنگ کو ہاتھ میں پکڑ۔ ابے اتنا ڈرتا کائے کو ہے؟ اللہ میاں کے ہاتھ میں اتی بڑی دُنیا کی اسٹرنگ ہے، وہ ذرا نئیں ڈرتے، ہور تو اِتی سی موٹر کے اسٹرنگ سے ڈر رئیا؟ —— ہور دیکھ یہ پاؤں کلچ پو رکھ۔"

"ہور سرکار، کبھی اپن جھک کو، پاؤں کے بجائے ہاتھ سے کلچ دبائے تو؟"

"تو اِتے دیر میں میرا مُوتا اُٹھ جائیں گا، ہور ساتھ میں تمہارا بھی، سمجھے گھدا کہیں کا۔"

"سرکار آپ تو گالیاں دے رئے۔" وہ احتجاج کرتا۔

"نئیں جی، آپ کو شیرینی بانٹوں گا کی کتے اچھے اچھے عقل کی باتاں کر رئے! ایسے چالوں سے وہ باورچی خانے کا موٹا چوہا بنے تا، اُتے ڈرائیور بن جائیں گا، مگر تو نئیں بن سکیں گا۔ سمجھا؟"

وہ بُرا مان جاتا۔ "میرے کو ہینڈل مارنا تو کتے اچھے سے آگیا۔ وہ چوہا ہینڈل

مار سکتا کیا؟"

نواب صاحب بے حد پیار سے اسے گلے لگا لیتے: "ابے رہا بچّہ کا بچہ۔ اگے ایک دِن تو تُو موٹروں کا بادشاہ بنیں گا، بادشاہ۔ ہور تیرے اِتی اچھی گاڑی چلانا ایک کو بھی نہیں آئیں گا۔ مَیں تو چوپ مذاخ کرتا رے۔ اچھّا چل، اب تو کیریاں توڑ کر لا دے ایک دو۔"

"نہیں سرکار، آپ بیمار پڑ جائیں گے۔" وہ مارے محبّت کے روہانسا ہو جاتا۔

"ہورے بیمار پڑوں گا تو تیرا کیا بِگڑ جائیں گا؟"

وہ بڑی حیرت سے انہیں دیکھتا، شکایتی لہجے میں کہتا "آپ بیمار پڑیں گے تو میرا کچھ بھی نہیں بگڑیں گا؟"

"اچھا ہے نا۔ گلا دُکھیں گا تو مَیں چُپ تو بھی بیٹھوں گا۔ نئیں تو تیرے کو بک بک جھک جھک کرتے رہتا نا۔"

اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر آئے "سرکار، میرے کو آپ کے گالیاں بھی اچھے دِکھتے۔"

سگی ماں سے وہ اتنا مانوس نہ تھا۔ ویسے بھی وہ ماں کے پاس جاتے اس لئے کتراتا تھا کہ ماں زنانے میں ہوتی تھی، اور وہاں پاشا سے مڈبھیڑ کے زیادہ امکانات رہتے تھے، جس سے وہ سخت گھبراتا تھا۔ کبھی ماں اس سے دستور کے مطابق عربی میں بات کرتی اور پاشا سُن لیتیں تو موقع نکال کر ضرور ڈانٹتیں۔

"موئے اپنی زبان میں غوَل غوَل غوَل غوَل کیا تو بھی بول لیتے رہتیں، غیبتاں کرتے ہوئیں گے میرے؟"

لیکن حقیقت اپنی جگہ یہ تھی کہ نہ شگوفے کی ماں نے اور نہ شگوفے نے

کبھی حویلی میں بسنے والے کسی بھی فرد کی غیبت یا برائی کی تھی، چہ جائے کہ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کی برائی۔

وقت کے پرندے نے دھیرے دھیرے اپنے پر پھڑپھڑائے ——— آزادی آئی ——— اپنے ساتھ بہت سی نعمتیں لائی، خوشیاں لائی۔ لیکن کچھ دل ٹوٹے بھی، کچھ خواب بکھرے بھی۔ اپنے مستقبل کو سنوارنے کی فکر میں کچھ لوگ پاکستان سدھارے۔ جنہیں اپنی مٹی اور وطن سے پیار تھا، وہ اس خاک میں مل جانے کی چاہ میں یہیں رہے، پھر ۱۹۵۰ء آیا ——— آزادی کے بعد ایک اور اہم موڑ۔ غریبوں امیروں کے بیچ جو دیوار تھی، اُسے ڈھانے کے لئے ایک قدم اور اُٹھایا ——— جاگیرداری کا خاتمہ!

شکورے کو بہت کچھ یاد تھا ——— اگر سب کچھ نہیں تو اتنا تو ضرور یاد تھا کہ وہ ماضی پر رو سکے۔

اس دن حویلی بھر کے نوکروں چاکروں کو بلا کر نواب صاحب نے کہا تھا:

"ہم نے اچھے دن بھی خدا کی مہربانی سے دیکھے تھے، ہور اَب جو دیکھیں گے وہ بھی خدا کی اچ مہربانی ہوئیں گی۔ مگر ہم یہ ہرگز نئیں چاہیں گے کی اپنے آنسو آپ لوگوں کی آنکھاں میں ڈالناں۔ آپ سوب لوگ جہاں جہاں چاہے، جا سکتے۔ ہم اب اس لائخ نئیں رہے کی اپنا بوجھ بھی اُٹھا سکیں۔ آپ کو چھوڑتے دل تو ٹوٹیں گا، مگر اس کو تو ٹوٹنا اچ تھا۔ اللہ آنکھاں بھی دیا۔ آنسو بھی دیا ——— سوب جھیلنا پڑتا..... ہور تم زیبن بی، شکورے کو لے کو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ عرب جاتے ہوئیں گے تو چلے جاؤ۔ ہم کو کرائے پڑتا پیسہ دے سکتے۔"

شکورا اپنے آپ کو پٹخ پٹخ کر رونے لگا تو نواب صاحب نے اسے گلے لگا کر کہا:

"بٹیا، تیرے باپ نے تیرے کو جب ہم نے مانگے تھے تو اللہ پر یقین تھا کی خود کھائیں گے، تجھے بھی کھلائیں گے، جو خود پہنیں گے، تجھے بھی پہنائیں گے۔ اللہ پر یقین تو اب بھی ہے، مگر رات بھی تو اللہ ہی بنایا تھا وئی اللہ جو صبح بنایا، روشنی بنایا، اندھیرا بھی بنایا۔ بٹیا، میں اتا خود غرض نئیں ہوں کی تم کو، اپنے آرام اور فائدے کے واسطے تکلیف میں رکھوں —— زیبون بی، شکورا بچہ ہے، ناسمجھ ہے۔ تم عمر والے ہے، سمجھ دار ہے۔ ہماری بات مانو۔ اپنے وطن کو چلے جاؤ۔"

"میں بچہ نئیں ہوں —— میں بچہ نئیں ہوں —— میرے کو موٹر چلانا بھی آتا۔ سب کاماں بھی آتے۔ میں سرکار کے پاس اچ رہوں گا۔ میں سرکار کے بغیر نئیں رہوں گا۔ اُنوں میرے باپ نئیں، اُنوں میرے سوب کچھ ہئیں۔"

سرکار —— سرکار ——

شاید اس کے اپنے آنسو اس کے ہاتھوں پر گرے تھے۔ گرم گرم آنسو۔ وہ چونک پڑا۔

آج وہ زندگی میں سب کچھ پا چکا تھا —— پھر بھی خالی ہاتھ اور تہی دامن تھا۔ بس یہ دو سوکھے مارے ہاتھ تھے جو اس کے ہاتھوں میں کانپ رہے تھے۔

اسے روتے دیکھ کر بڑی بی حیرت سے بولیں: "آپ کائے کو روتے پاشا؟"

لیکن ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ درد سے چیخ اُٹھا "پاشا، مجھے پاشا نہ کہیے، میں تو ...."

مصلحتاً وہ رُک گیا۔ 'نہیں نہیں، مجھے اپنا تعارف نہیں کروانا چاہیئے —— اچھا ہے میں پردے میں رہوں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں کون ہوں تو وہ احساسِ گناہ اور ندامتوں کے سمندر میں غرق ہو جائیں گی۔ مجھے —— مجھے اپنے آپ کو

چھپائے رکھنا ہے" وہ خود سے بولا۔

اُس نے آنسوؤں سے بھاری، بوجھل آواز میں رُکتے رُکتے بات پُوری کی۔

"اصل میں مجھے نواب صاحب کی یاد آگئی تھی، ضبط نہ کرپایا"

"پاشا، اَب آئے تو ذرا دو گھڑی بیٹھ کر تو جاؤ میاں آپ —— چائے وائے۔۔۔۔۔"

"جی —— نہیں نہیں، آپ اس تکلف میں نہ پڑیں، میں پھر آؤں گا — اور خدا کے لیے مجھے پاشا نہ کہیں"

"ایسا کیسے ہوئیں گا۔ نواب صاحب رہتے، ہور آپ آتے تو۔۔۔۔"

وہ بات کاٹ کر بے حد دُکھ سے بولا: "آپ کم سے کم مجھے، آپ تو نہ کہیے۔ میں تو آپ سے بہت چھوٹا ہوں"

"اب تو وقت نے ہم کو سب سے چھوٹا کر دیا، بیٹیا —— آؤ، اندر تو آؤ"

سینہ بالوں سے ڈھکا، کانپتا لرزتا سر ڈھانپتی وہ آگے بڑھیں تو وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔

جھونپڑے میں داخل ہوتے ہی آنسوؤں کا ایک بگولہ اس کے سینے سے اٹھا اور ٹھیک حلق میں آکر اٹک گیا۔

اے مالک —— اے میرے خدا! اے میرے ارحم الرحمین! تو جو ہر چیز پر قادر ہے، کیا کوئی ایسی ہوا نہیں چلا سکتا جو دل سے اُمڈنے والے آنسوؤں کو خشک کر دے۔ اسے اونچا برڈ زمین سے ٹھوکر لگی اور سارے زمانے کے وہ ستم یاد آئے۔ وہ مخملیں تہہ در تہہ گدیلے اور قالین یاد آئے جو چلنے میں بالشت بالشت بھر دب جایا کرتے تھے —— اور اب اس جگہ وہی پاشا رہتی ہیں —— ! میرے خدا!

بڑی بی نے بڑی دیر سٹر پٹر کی۔ ایک ایک خالی ڈبا ٹٹولا، کھنگالا۔ ایک ایک چیتھڑا کھولا، پھر شاید کچھ پیسے برآمد کئے۔ پڑوسن کی اسی عورت کے پاس گئیں جو انہیں خالہ کہہ کر بات کر رہی تھی، اُس کے کانوں میں کچھ کھُسر پھُسر کی اور پھر شکُور کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ اس کے پوچھے بغیر ہی اپنی بپتا سُنانے لگیں۔

"کیا بتلاؤں بٹیا، کیسی سزا اللہ دیا —— ضرور ایسے گناہ کری ہوں گی جو اس مالک کو پسند نئیں آئے ہوئیں گے۔ بہُوت اچھے زمانے دیکھی تھی بٹیا۔ اب لوگوں کے مرچیاں کوٹ دیتی۔ کسی کا اچار ڈال دیتی، کسی کی بڑیاں دال پیس پیس کر بنا دیتی۔"

شکُور کو وہ محل کی چوہری تہوں والی صافیاں یاد آئیں، وہ پاپوش گیر یاد آئے جو اپنے وجود سے بھرپور نرمیاں پہنچانے کے جتن کرتے تھے اور پھر بھی ان نازک ہاتھوں پر چھالے پڑ پڑ جاتے تھے —— آج ہاتھوں پر چھالے نہیں پڑتے، دِل پر آبلے پڑتے ہیں کہ زمانے کی روش یہی ہے۔

اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر مٹّی کی سکوری کا مدھم سا چراغ جلا کر ایک ڈبّا اوندھا کر کے اس پر رکھ دیا، تاکہ اونچائی کی وجہ سے پورے جھونپڑے میں یکساں روشنی قائم رہے۔ اور اُن آنسو بھری جلی آنکھوں کو وہ جگمگاتے ہوئے محل یاد آئے جن میں چھکا چھک اُجالوں سے بھرپور فانوس روشن رہتے تھے۔ اور سرِ شام محل سرا کا مشعلچی یہاں وہاں چراغ، جھاڑ اور فانوس روشن کرتا پھرتا تھا۔

'اے دِل! اے دِل! ایک ساتھ اتنے تیر نہیں، تھوڑی سی جگہ تو چھوٹ جائے' میرے مالک!"

پھر اُسی کونے میں اُنہوں نے پھُونکیں مار مار کر کچھ کچرا، کچھ لکڑی کی کھپچیاں جمع کر کے آگ جلائی، چولہے پر ایلومونیم کی میلی سی کڑھائی چڑھائی۔ پھر اُن آنکھوں نے جگر مگر کرتے چاندی کے وہ برتن دیکھے جو سُرخ سُرخ دسترخوانوں پر چاندی کی چوکیوں

پر سلیقے سے چُنے جاتے تھے۔

پھر تیز تیل کی ناگوار بُو آئی۔ چھن کر کے کوئی چیز بگھاری یا پکائی گئی — پھر ایک کپڑے کی میلی سی دھجی میں لپٹی ہوئی غالباً دوپہر کی روٹیاں۔ اور ایک تلا ہُوا انڈا ایک میلی سی تام چینی جھڑی رکابی میں لے کر وہ اس کے پاس آئیں اور بے حد غریبانہ لہجے میں، جس میں خوشی کی بھی چھاپ تھی، بولیں "لیو بٹیا، دو نوالے کھا لیو — معلوم ہے، انڈا ہے انڈا۔"

دِل میں کتنے سارے شیشے ٹوٹے — کسے خبر؟ وہ خوشبوؤں بھرے پکوان۔ وہ سونے کا چھپر کھٹ — وہ اشرفیاں اگلتی تجوریاں — وہ محل، دو محلے — اور آج انڈے کا یہ اہتمام! اس نے اپنے حلق میں کھاری پن محسوس کیا۔

"با —" اُس نے اپنی زبان پہ روک لگائی۔ نہیں باشا نہیں۔ باشا کے کہنے سے ممکن ہے انہیں میرا بچپن یاد آ جائے — میں انہیں اماں بی کہوں گا — ہاں یہی ٹھیک ہے — آخر کو وہ میری ماں ہی تو ہوئیں — جب میں نواب صاحب کو اپنا باپ سمجھتا تھا تو . . . ."

وہ بڑی مشکل سے آواز نکال سکا۔ اماں بی، نواب صاحب پر . . . ."

وہ بات پوری نہ کر سکا — آنسوؤں سے اس کا گلا رُندھ گیا۔

بہت دیر تک بڑی تکلیف دہ خاموشی رہی — ملگجی روشنی میں ان کا سینے پر جھکا ہوا سر رہ رہ کر کانپتا رہا۔ سامنے رکابی میں انڈا رکھا ہوا تھا۔

"ارے کھانے کا وقت ہو گیا! تیرے کو بھوک لگی ہوئیں گی نا — اچھا دیکھ، چُپکے سے جا کو مرغی کی ایک ٹانگ . . . ."

ٹپ — ٹپ — ٹپ!

مذہب میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹ دینا ہے — اسے ایسا لگا آسمانوں پر

اللہ میاں اپنے فرشتوں کو حکم دے رہے ہوں گے: "اے فرشتو، ہمارا یہ بندہ جو ایک بچے کو چوری سکھایا کرتا تھا، جانتے ہو کس سزا کا مستحق ہے؟ جاؤ اس کے ہاتھوں میں موتیوں اور ہیروں کے کنگن پہنا دو کہ وہ یہ بُرا کام ایک یتیم کو اچھا کھانا کھلانے کے لئے کیا کرتا تھا۔

اور جب وہ مہربان انسان مجھے جھوٹ بولنا سکھاتا تھا تو اللہ تعالیٰ کراماً کاتبین کو حکم دیتے ہوں گے: "اس کے اعمال نامے میں آج صرف نیکیاں ہی نیکیاں درج کی جائیں کہ اس نے کسی کا دل رکھنے کی خاطر جھوٹ بولا ہے۔"

اور گالیاں دینے والی اس پاکیزہ زبان کے لئے خداوند تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہوگا: "اے فرشتو، میرے اس خاص اور نیک بندے کے لئے جنت کے اس چاندی سونے والے محل میں موتیوں کی پچی کاری بھی کرو کہ آج وہ عظیم روح یہاں آنے والی ہے جس کے نامۂ اعمال میں کوئی برائی ہی رقم نہیں کی گئی۔"

"کھاؤ بٹیا —— اب وہ دن بھی نہیں رہے، وہ نواب صاحب بھی نہیں رہے۔"

ایک دم آنسوؤں کا وہ گولہ جو حلق میں چھپا بیٹھا تھا، آنکھوں کے راستے پھوٹ بہا۔

نواب صاحب نہیں رہے ——

نواب صاحب نہیں رہے ——

نواب صاحب ....

اچانک اسے احساس ہوا کہ کتنی عظیم دولت سے وہ محروم ہو گیا ہے —— ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے اپنا دل پکڑ پکڑ لیا۔

"کلُ نفس ذائقۃ الموت" اس نے اپنے آپ کو ڈھارس دینی چاہی، ہر انسان

کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ مگر قرآن شریف کی آیت بھی اس کے دل کا قرار لوٹا نہ سکی۔

پھر اس نے دل کو تھام کے اپنے آپ کو سنایا:

جب احمدِ مرسل نہ رہے تو کون رہے گا؟

قطرہ قطرہ لہو اس کے دل سے ٹپکتا رہا —— وہ دل ہی دل میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر درود پڑھتا اور دُہراتا رہا۔

جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا؟

ایلومونیم کے کٹورے سے پانی کے دو گھونٹ پلا کر بڑی بی نے بڑی محبت سے کہا:

"بٹیا رزخ سامنے ہو تو رونا ہور ٹھکرانا نہیں چاہیئے، ماں —— ہور پھر مَیں تو انڈے کا انتظام کر رہی تھی۔

"اُس نے بڑی زخمی نگاہوں سے انہیں دیکھا ——

"اماں بی ——" پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ نوالہ بنا کر اس کے مونہہ تک لا چکی تھیں۔ اس نے بچّوں کی طرح مونہہ کھول دیا۔

امّاں بی کو اُس نے جھونپڑے سے باہر نکلنے ہی نہ دیا کہ گاڑی تک چھوڑنے آئیں گی تو خواہ مخواہ ٹھوکریں لگیں گی —— البتّہ ان کی پڑوسن چھوڑنے آئی تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا "امّاں بی کے بچّے بھی تو تھے؟"

"ہو تھے نا ماں۔ بٹیا تو مر گیا تھا —— بٹی کو اس کا میاں آزادی مل سو وخت، خود پاکستان چلا گیا۔ بعد میں کتے بلا یا تھا سو یاں معلوم نئیں کیا بھیا پڑی کیا نئیں۔ ہمارے ایک پہچان کے اپنے اب وہ سال پہلے کراچی گئے تھے تو لوجلے ایک مسجد کے سامنے بھیک مانگنے والے دیکھے تھے —— مَیں بولی۔ تم کیسا پہچانے

باوا، تو بولے: میں مہرپاشا بولوں کے پکارا تو اُنوں جھٹ پلٹ کر دیکھے۔ مہرپاشا اچ نام تھا اُنوں کا ــــ"

شکورے نے درد سا سینے میں اُٹھتا محسوس کیا ــــ "اور اماں بی کو اس بات کا پتہ ہے؟"

"اَئی نئیں ماں ــــ نئیں۔ انوں کو بولتے اچ نئیں دی ــــ کل کے مرتے، نئیں تو آج ہی مرجائیں گے انوں۔ مگر پھر ہور ایک پہچان کے بجنے آئے تو وہ بول رئے تھے کہ مہرپاشا مر گئے ــــ"

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

شکور نے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر بڑی شرمساری کے ساتھ ان کی طرف بڑھائی اور کہا: "آپا، آپ کے لئے ہے ــــ بُرا نہ مانیے میں کسی خراب نیت سے نہیں دے رہا ہوں۔ اور اماں بی سے ملنے میں کل پھر آؤں گا ــــ"

اپنے عالی شان ہوٹل کے شان دار کمرے میں فوم بیڈ پر پڑے پڑے احمداللہ شکور کو وہ سارے زمانے یاد آئے ــــ نواب صاحب کا کھیل کھیل ہی میں اسے موٹر چلاتے ہیں، موٹر کے پارٹس اسمبل کر دینے میں ماہر بنا دینا۔ پھر زوالِ حیدرآباد۔ پھر جاگیرداری نظام کا خاتمہ ــــ پھر نواب صاحب کی آسائش کے خاتمے کے ساتھ کئی خاندانوں پر کسمپرسی کا عالم۔ پھر ان کی آخری مہربانی۔ کویت میں اپنے ماموں کے پاس اس کا پہنچنا۔ پھر موٹروں کی لائن میں اس کا گھس جانا۔ اس کا کھیل کھیل میں مکینک بن جانا، اسے کہاں سے کہاں پہنچا گیا۔ اسے یاد آیا، پہلی بار ایک کویتی احمد بن عالم نے محض کار کی اگنیشن ٹربل خراب ہو جانے پر، کار ہی پھینک دی تھی۔ اُسی کے پاس چھوڑ دی تھی۔ خوب دولت تھی ــــ نئی کار خرید لی ــــ پھر اُسے یہ بزنس ہی ہاتھ لگ گیا۔

معمولی خرابی والی گاڑیاں سستے داموں لیتا اور مرمت کر کے خاص طور سے پاکستان "ری کنڈیشنڈ" گاڑیوں کے حساب میں بھیج دیتا ـــــ کیسے کیسے لوگوں سے اس کا میل نہ بڑھا؟ انگلش بولنے والے ـ اُردو بولنے والے، عربی، فرنچ بولنے والے۔ ملیالم، تیلگو، ہندی ـــــ کتنی زبانوں پر اسے عبور حاصل ہوا ـ اور کتنے ڈالر، کتنے پونڈ؟ کتنے درہم، کتنے ریال اور کتنے دینار میں اس کا ہر ہر ملک میں بینک بیلنس بڑھا۔ خدا کی بے پناہ مہربانیاں باہیں کھولے ہر مقام پر اس کی منتظر رہتیں ـــــ اور وہ سوچتا: یہ خدا ہی ہے، جسے چاہے عزت دے....

اور اب مدتوں بعد وہ اس سرزمین پر واپس آیا ـــــ وہ نواب صاحب کی بھولا تھا نہ ان کی محبت کو۔ خرابی یہ رہی کہ وہاں کویت میں جب بھی وہ نواب صاحب کے بارے میں پوچھتا تو کسی نہ کسی کی زبانی اسے یہی پتہ چلتا کہ سارے حیدرآباد کے نواب صاحبان یا تو پاکستان چلے گئے، یا تو امریکہ یا لندن ـــــ لیکن پھر بھی وہ پوچھتا پاچھتا بچپن کی یادوں کا سہارا لے کر اماں بی تک تو پہنچ ہی گیا۔ اور اُس نے جو کچھ دیکھا.... اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا، لیکن گرم گرم آنسو تکیے کو بھگوتے ہی رہے۔

وہ اپنے ایک دوست کے بے حد اصرار پر اس کی شادی میں یوں ہی حیدرآباد چلا آیا تھا ـــــ قیام کے بارے میں تو اس نے دوست کو لکھ دیا تھا۔ کہ کسی اچھے سے ہوٹل میں کر لوں گا، البتہ گھومنے پھرنے کے لئے اس نے دوست کو بہت سمجھا کر لکھ دیا تھا "اب جاتے ہیں کتنے دن وہاں رہ پڑوں۔ ٹیکسیوں میں گھومنے پھرنے سے بہتر یہی ہے کہ تم میرے لئے ایک مرسی ڈیز کار خرید دو ـــــ پیسے کی فکر نہ کرنا۔ حیدرآباد میں نہ ملے تو بمبئی سے لے کر آ جانا۔"

اصل میں حیدرآباد میں اس نے غربت کے بہت سارے دن گزارے تھے چاہتا تھا اب ان ہی سڑکوں پر اپنی ذاتی کار میں بھی گھوم پھر لے ـــــ آتے وقت

گاڑی بیچ دیں گے ـــــ تھوڑے بہت نفع سے ہی جائے گی ـــــ مری ڈیز میں نقصان کا سوال ہی نہیں اُٹھتا ـــــ لیکن یہاں آکر جس جھٹکے سے وہ دوچار ہوا اس سے سنبھل نہ پایا ـــــ اماں بی کی کس طرح مدد کرے ؟ کس طرح انہیں ایک اچھے سے فلیٹ میں شفٹ کرے ؟ کس طرح ان کی موجودہ کلفتوں کا ازالہ کرے ؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی شخصیت کیسے ان سے پوشیدہ رکھے ؟ ـــــ وہ توبہ توبہ کر کے گالوں پہ ہاتھ مارنے لگا : اے خدا ، کبھی کسی امیر پہ وہ وقت نہ لا کہ اس سے کم تر کو اس پر حاکم کر دے ۔

پھر وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ـــــ اے قادرِ مطلق ! اے عالم الغیب ! تو دلوں کا بھید جاننے والا ، تو ہر بات پر قادر ہے ـــــ تو سب جانتا ہے ـــــ میں گناہ گار ، تجھ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میرے دل میں اماں بی کی پچھلی باتوں کا کوئی ملال نہیں ہے ۔ میرا دل آئینے کی طرح صاف اور پاک ہے ـــــ مجھ گناہ گار کو تو یہ توفیق دے کہ میں ان کے لئے کچھ کر سکوں ، اس طرح کہ اس غیرت مند بی بی کو بھیک یا خیرات کا گمان تک نہ گزرے کہ واقعی میں نذرانے کے طور پر ہی انہیں کچھ دینا چاہتا ہوں ؛

دوسرے دن جب وہ سو کر اٹھا تو اس کا دماغ بے حد بوجھل تھا ۔ پھر بھی اس کا دل ایک سکون سا محسوس کر رہا تھا ، کیوں کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ اماں بی کو کس طرح ایک آسائش بھری زندگی تحفے میں دی جائے ۔

وہ ان کے جھونپڑے میں بے حد انہماک سے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا ، گویا کچھ ڈھونڈ رہا ہو ـــــ اچانک ایک پھٹیچر قسم کے گھسے گھسائے بد قلعی پاندان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں ـــــ

"اماں بی ——" وہ بڑی رازداری سے بولا "آپ کو پتہ ہے، آج کل عرب ممالک میں پرانی چیزوں کی بے حد ڈیمانڈ، یعنی مانگ ہے —— آپ کے پاس کچھ چیزیں ہوں گی ضرور۔ دن بدل جائیں گے آپ کے بھی اور میرے بھی۔" وہ بناوٹی ہنسی ہنسا۔

اماں بی نے اسے عجیب دُکھ بھری نگاہوں سے دیکھا "میرے پاس کیا تو بھی ہے ماں —— اُنوں کے مرے بعد تو نئیں بھی کس کا خرصہ ہوئیں گا تو ایک ایک قرض والے اپنا اپنا خرصہ نکال کو آتے تھے —— سارا سامان اٹھا کو لے گئیں۔ پُرانے سامان میں بس ایک میں اِچ رہ گئی۔"

ماحول ایک غمناک فضا میں تبدیل ہو گیا۔ بڑی مشکل سے شکور بولا "اماں بی ایک چیز تو مجھے نظر آرہی ہے —— آپ دینا نہ چاہیں تو الگ بات ہے۔"

"کیا ہے ماں وہ چیز؟" وہ حیرانی سے بولیں ——

"وہ پاندان!"

"اَئی وہ —— مُوا اُجاڑ مارا پھینکے کا۔ کوئی دو کوڑی میں بھی نئیں لینے والا ——" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیں۔

"ارے ماں بی، آپ بس ہاں تو کہہ دیں —— ارے اماں بی، یہ تو اینٹیک میں شمار ہو گا، اینٹک میں —— میرے پاس تو ایسے ایسے گاہک آتے ہیں کہ مرتے ہیں ایسی چیزوں پر۔ مونہہ مانگے دام دے کر جاتے ہیں —— تو فرمائیے، دے رہی ہیں آپ؟"

اماں بی نے اس کے جگمگاتے ہوتے ماتھے کو غور سے دیکھا —— سانولی رنگت بھی اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے! یا پھر یہ اس کے اندر کی نیکی تھی جس نے اس کے سانولے چہرے کو یہ نُور اور حسن عطا کر دیا تھا؟

"لے لیو بیٹا —— اب میں کسی بات کو نئیں نئیں بولوں گی۔"

"ارے اماں بی، لاکھوں میں بکے گا تب یقین آئے گا آپ کو ——"

چار دِن تلاش کے بعد، شکور کو ایک انتہائی خوب صورت اور شان دار بنگلہ چھ لاکھ روپے میں مِل گیا۔ ہر چند کہ یہ نواب صاحب کے پُرانے محل کی برابری نہیں کر سکتا تھا، پھر بھی وہ خوش تھا کہ اماں بی کے رہنے کے لئے اب نسبتاً ایک ٹھیک جگہ تو ہو گئی ہے۔ اوپر سے پچاس ساٹھ ہزار لگا کر اس نے آرام دہ قالین، فرنیچر، فوم کے بستر، فریج، کراکری، ہر چیز خرید کر گھر کو دُلہن کی طرح سجا دیا ——

اماں بی تنہا نہ رہیں، اسی لئے ان کے بھروسے کی اسی پڑوسن اور اس کے بچوں کو بھی وہیں ٹھیرانے کا مستقل بندوبست کر دیا۔

جب بنگلے کی ہر چیز اپنی انتہائی حدوں تک خوب صورتی سے تکمیل کو پہنچی تو اُس نے ایک دن عابد روڈ کے سب سے پوش اور اکمل مارکیٹ میں جا کر اماں بی کو بیش قیمت نفیس ساڑیاں دِلائیں۔ وہیں ٹیلر کو ناپ دِلوا کر کُرتے سلوانے کو دے دئے — چھوٹی بڑی ضرورتِ زندگی کی ہر ہر چیز دِلا کر انہیں اپنی مرسڈیز میں بٹھا کر بنگلے تک لایا۔

پھر پہلے خود اُترا۔ اور مودّب شوفر کی طرح لپک کر گاڑی کا دروازہ کھول کر اماں بی کو اُتارا۔

اتنے زمانوں سے جھونپڑی میں رہتے رہتے اماں بی پُرانے دن بھُول چکی تھیں —— سَر اٹھا کر خوب صورت گیٹ اور بنگلے کو دیکھا تو ان کا کم زور جسم ڈول گیا —— شکور نے ان کو لپک کر تھام لیا۔

دھیرے دھیرے چار سیڑھیاں چڑھا کر وہ انہیں ڈرائنگ رُوم میں لایا، اور آہستگی سے شیشے کے نازک گلدان کی طرح نرم فوم کے صوفے میں بٹھا دیا۔

آنکھوں کی تپتی سنگلاخ زمین پر پُرانی یادوں نے آنسوؤں کے پھُول کھِلا دئے وہ پھپھک پھپھک کر رو دیں۔ مگر خون سے خالی جسم میں پانی کی بھی کمی تھی۔ اس لئے چیخیں، سِسکیاں زیادہ نکل رہی تھیں، آنسو کم۔ وہ بچّوں کی طرح بغیر شرم اور جھجک کے رو رہی تھیں۔

شکوُر شرمندہ شرمندہ سا سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ دھیرے سے بولا:

"اماں بی گاڑی بھی آپ کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں ——— بس غم یہی رہے گا کہ آپ کی شان کے لائق کچھ نہ کر سکا۔"

"بٹیا ———" وہ کچھ کہنے کو ہوئیں، مگر گلے میں زندگی بھر کے سارے غم ایک ساتھ آکر ٹھیر گئے تھے ———

"آپا اور بچّوں سے کہہ دیا ہے، وہ ہمیشہ کی طرح آپ کا خیال رکھیں گے ڈرائیور بھی اتفاق سے آپا کی پہچان کا ہے ——— ہر مہینے آپ کا گھر کا خرچ اور ڈرائیور کی تنخواہ بھیجتا رہا کروں گا، آپ خط لکھواتی رہا کیجئے گا۔ میں پتے لکھے جا رہا ہوں، یہیں ڈائری میں ——— آپ کو ساتھ ہی کویت لے جاتا، لیکن جانتا ہوں آپ کو اسی مٹی سے پیار ہے۔"

اماں بی دھیرے سے اُٹھیں، شکور کے پاس جاکر رُکیں اور بولیں: "بٹیا، وہ میرا پاندان کہاں ہے جو اتنا قیمتی ہے کہ دس بارہ لاکھ میں بکنے والا ہے۔"

شکوُر نے کچھ حیرت سے انہیں دیکھا ——— پُرانے سامان کے ڈھیر میں سے وہ اپنا وہی پاندان اُٹھا کر لے آئی تھیں۔ اسے ایک نیچے کو دیکھ کر بولیں "جا، اسے باہر کچرے میں پھینک کر آ جا۔"

پھر اچانک وہ شکور کے کندھے سے سر لگا کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگیں۔

"میرے بچّے ——— تو اس زمین کا انسان نہیں، آسمان کا فرشتہ بننے کے لائق تھا۔

تو کیا سمجھا کہ میں تیرے کو پہچانی نئیں ؟ تیری وہ بھولی بھالی صورت، جیسی کی ویسی اِچ ہے، بس تو بڑا ہوگیا۔ ورنہ کیا ایسی عورت کو جس نے تیرے کو سدا جلائی، اتے خوشیاں اتا سکھ، اتا آرام کیسے دیتا ؟ " تو نے اپنی پہچان اس واسطے میرے کو نئیں بتایا کہ تو نئیں چاہتا تھا کہ میں شرمندہ ہوؤں۔ کیسے پُل صراط پو تو یہ چار چھ دن سے چل ریا تھا —— ایک ایک لمحے پو تیرے، میری نظر تھی —— مگر تو پار اُتر گیا —— میرے بچے —— تو پار اتر گیا۔ آزمائش کا اتا لمبا پُل تو کیسی آسانی سے پار کرلیا، میرے چاند —— ہور میں دوزخی راندُ بھگتاں بھگتے کو رہ گئی۔ یوم حساب رہتا بولتے ایک —— جس میں خدا سوب کے حساب لیں گے۔ تیرا یوم حساب آج اِچ پورا ہوگیا۔ اب تو زندگی میں کتنے بھی گناہ کرا تو اس کا حساب نئیں لئے جائیں گا —— یہ میں بول رئی —— میں گنہ گار! میں توبہ توبہ کر کے بولتی، میں کوئی خدا کی نیک بندی نئیں، ولی نئیں، پن میں تیرے کو جنت کی بشارت دیتی، کیوں کہ یہ انسان کا اپنا دل اِچ ہے جو بتا دیتا ہے کہ جنت کس کی ہور دوزخ کس کی —— تو تو بیٹا فرشتہ ہے، بخشا گیا —— پن میرے جی سے یہ غم کون دھوئیں گا کہ تیرے کو جیتے جی جو میں دوزخ بخشی تھی اُس ....."

شکور نے اُن کے موہنہ پر ہاتھ رکھ دیا —— "اب خدا کے لئے آگے کچھ نہ کہئے، اماں بی —— آگے کچھ نئیں، ورنہ میں چیخ چیخ کر رو دوں گا ——"

اور یہ کہتے کہتے وہ خود بھی اماں بی کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

طلاّخ! طلاّخ! طلاّخ!

"بول:

"طلاّخ!"

"طلاّخ!"

"طلاّخ!"

شیر خاں کے سینے سے بندوق لگی ہوئی تھی۔ دل اندر سینے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔
کہے یا نہ کہے ــــ کہے یا نہ کہے؟
تین بار طلاق کہہ دیتا ہے تو زندگی کی ساری خوشیاں ختم! اور نہیں کہتا تو زندگی ہی ختم!

شیر ہی کی طرح بہادر شیر خاں نے بے بسی سے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ پسینہ اس کی کنپٹیوں سے، گردن کے اُتار سے، پیشانی سے، سینے کے گھنے بالوں سے دھاریں بن بن کر بہہ رہا تھا۔

"نکو سرکار، یہ ظلم نکو کرو۔ مہرو میری زندگی سے بھی بڑھ کو ہے۔"

"اب ہم تیرے کو آخری بار حکم دیتے ہیں کی تو تین بار طلاخ، طلاخ، طلاخ بول ـــ نہیں تو ابھی یہ گولی تیرے اِدھر سے اُدھر ہو جائیں گی ـــ،" نواب صاحب نے پھنکار کر کہا۔

سامنے ہی چبوترے پر بیٹھی مہرو بڑی خوں خوار نگاہوں سے نواب صاحب کو گھور رہی تھی۔ ایک دم وہ زور سے چلا کر اپنے میاں پر برسی۔

"اگے تین بار طلاخ بولنے کو تیکو موت آرئی کیا؟ میں نئیں تو دوسرے ہزار عورتاں مل جائیں گے، تیکو اپنی جان نئیں پیاری کیا؟" حد درجہ تیز مزاج تھی وہ ـــ

اب نواب صاحب مہرو سے ہی مخاطب ہو گئے:

"دیکھ، اس کو سمجھا دے۔ اب ہم ہور صبر نئیں کرنے والے ـــ"

مہرو اپنا دوپٹہ سنبھالتی، تقریباً دوڑتی ہوئی شیر خاں کے پاس آئی اور غصے سے بولی: "چل بول: میں جمال خاں اپنی زوجہ مہرو کو تین بار طلاخ دیا ـــ طلاخ دیا ـــ طلاخ دیا ـــ"

شیر خاں نے اپنے لمبے چوڑے سرکش جسم کی ساری طاقت لگا کر منمنی آواز نکالی۔

"میں جمال خاں اپنی زوجہ مہرو کو تین بار طلاخ دیا ـــ طلاخ دیا ـــ طلاخ دیا۔"

مہرو نواب صاحب کو دیکھ ناگن کی طرح پھنکاری۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی: "نواب صاحب، یہ تین لفظاں یاد رکھنا ـــ"

واہ ری قدرت! اِتنے دِنوں کا پیار بھرا ساتھ تین ہی لفظوں میں ختم!

نواب صاحب نے بندوق شیر خاں کے سینے سے ہٹا کر غصّے سے کہا "دُعا دے اپنی عورت کو، کی آخیر وخت میں بھی کام آ گئی، نئیں تو ابھی تیری لاش تڑپتی رہتی تھی یہاں ——"

"اب میں کیا کروں موئی؟ کاں جاؤں؟" شیر خاں وہیں بیٹھ گیا۔ گھٹنوں میں مونہہ چھپا کر بچّوں کی طرح رونے اور عورتوں کی طرح بین کرنے لگا۔

اچانک نواب صاحب مہربان ہو گئے۔

"کاں جاؤں —— ؟ کیوں، کیا ہمارے زمیناں نئیں ہیں یا ہم اتنے کنجوس ہو گئے کی ایک آدمی کو پیٹ بھر کو کھلا بھی نئیں سکتے؟"

"زمیناں؟" مہرو گھبرا کر بولی: بچّہ پاشا، اتی دُور کاں تو بھی بھیجتے آپ بے چارے کو —— بس یہاں چ کئیں بھی حویلی میں کوئی کام دے دیو پاشا —— آپ پاشا دیکھے نئیں کتّا کام کا آدمی ہے۔ کیسی آپ کی جان بچایا سو۔"

یہ حقیقت بھی تھی —— نہ جمال خاں ہوتا، نہ اس وقت نواب صاحب زندہ نظر آتے۔

حیدر آباد دکن سے چند میل کی دُوری پر نواب صاحب کا خوب صورت گاؤں 'موسم' واقع تھا۔ جب وہ جوان ہوئے اور پہلی بار بڑے نواب صاحب کے ساتھ زمینات پر گئے تو دیکھتے ہی رہ گئے۔

"ابّا حضور، اتّا خوب صورت نام 'موسم' کون رکھے کی؟ یہاں تو ہر موسم خوب اچ اپنی اپنی بہار لُٹاتا ہوئیں گا۔"

"جی ہو بیٹا۔ ہور سب سے بڑی بات تو یہ کی یہاں پو خوب شکار ملتا بیٹیا ——"

پھر تو بیٹے نے، ہرن، سانبر، نیل، چیتے اور شیروں کے ڈھیر لگا دیے۔ ابا حضور نے بڑے فخر سے لمبے چوڑے ہال میں اُن کی کئی قدِ آدم تصویریں فریم کرا کے لگوا رکھی تھیں، جن میں وہ اپنے ہاتھوں مارے ہوئے شیروں کی گردنوں پر پاؤں رکھے، بر جیس ڈاٹے مونچھیں اکڑائے اور سینہ تانے کھڑے تھے۔

لڑکوں کے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ شروع جوانی میں جو راستہ سب سے پہلے نظر آ گیا، اسی پر چل پڑے۔ کسی نے شراب کباب کو شروع شروع میں دیکھا، اسی کو اپنا لیا —— کسی نے آگے پیچھے کوئی طرار سی لڑکی دیکھی، بس لڑکیوں کو ہی کھوجتا رہ گیا —— کسی کو کتابوں میں دلچسپی نظر آئی، اسی کا ہو کر رہ گیا۔ پھر ماں باپ جہاں بھی اپنی پسند سے شادی کر دیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نواب سلیم نے آنکھ کھولی تو بندوق ہاتھ میں آئی۔ شکار میں ایسے دیوانے ہوئے کہ حویلی کی لڑکیوں کی فوج بھی ان کے سامنے کپڑے اتار کر کھڑی ہو جاتی تو وہ جھاڑوں کی طرف ہی دیکھتے رہ جاتے کہ شاید کوئی چڑیا ہی بیٹھی نظر آ جائے۔

ایسے میں بڑے سرکار اور بڑی پاشا نے اپنی پسند سے دھوم دھڑاکے سے اپنی ہی ٹکر اور حیثیت کے ایک نواب خاندان کی بڑی صاحب زادی سے ان کا بیاہ رچایا اور وہ پھول جیسی دُلہن کے ایسے دیوانے ہوئے کہ سال پیچھے ایک بیٹے کی ماں بناتے گئے۔ اب خیر سے تین لڑکوں کے باپ تھے اور دُلہن پر ایسے فدا تھے کہ مدتوں سے شکار کا شوق بھی پیچھے پڑ گیا تھا۔ اکثر مذاق میں اپنی دُلہن سے کہتے "ہم تو شکار کے ایسے دیوانے بن گئے تھے کہ ہم کو معلوم بھی نہیں پڑا کہ اللہ میاں ایسے ایسے شوخ بھی دُنیا میں اتارا بول کے۔

دُلہن اپنے ماں باپ کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ حد درجہ نازوں کی پلی وہ خود کو اسی محبت اور توجہ کا مستحق سمجھتی بھی تھیں، اور حویلی کے مردوں اور جوان لڑکوں

میں شاید نواب سلیم واحد مرد تھے جو صرف اپنی دُلہن کے تھے، اور بڑی بات یہ کہ اُن کے دیوانے بھی تھے۔

"آپ ہم کو ناکارہ بنا کو چھوڑ دئے، بیگم ——" وہ چاپلوسی سے کہتے۔

"چلو ہٹو، اب آپ گلابی لاڑاں نکو بناؤ۔ نئیں تو پھر اگلے سال میں ایک ہور چھوٹے پاشا موجود!

وہ اور بھی ان کی گود میں گھُسنے لگتے۔ خاندان بھر میں اُن کی جوڑی مثالی مانی جاتی۔ دوست احباب طعنے بھی دیتے، ہنسی مذاق بھی کرتے۔"

"کیا حضت —— اب زندگی بھر کو ایک اِچ شکار پو خانع ہوگئیں آپ؟"

"اب آپ لوگاں سے کیا بتاتا بھائی۔ جتنے لمبے بالاں ہیں نا ہماری بیگم کے، اُتی ہی لمبی زنجیر ہماری جیدکی۔ ہور ہم اس خید میں خوش بھی ہیں۔ آپ نا کیا معلوم جو ایک باؤلی کا پانی پیا سو اس کے موبہہ کو دوئی اِچ پانی کا مزہ لگ جاتا، ہم کو اللہ مٹھے پانی کی باولی دیا۔"

لیکن ان ہی دنوں 'موسم' موضع سے خبر آئی کہ ایک شیر ہر دو تین دن کے وقفے سے آتا ہے اور کوئی نہ کوئی جانور اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ اگر جانوروں کو چھوڑ کبھی اس کے موبہہ کو انسانی خون لگ گیا تو لوگ موضع چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگیں گے۔ پھر زمینات اور کھیتوں کا کیا ہوگا؟ سو اس طرح بہت عرصے بعد پھر نواب سلیم کو شیر کا قصہ پاک کرنے کی خاطر 'موسم' جانا پڑا۔

وہاں پہنچ کر اُنھوں نے زندگی میں پہلی بار وہ منظر دیکھا جو کبھی سوچا تھا، نہ دیکھا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے کہ مچان کس مضبوط جھاڑ پر بندھوانا مناسب رہے گا اور ہانکا کتنے بڑے گھیرے کا لینا ہوگا، وہ بندوق تھامے، جھاڑوں کو تاکتے چلے جا رہے تھے کہ

سامنے کی جھاڑیوں میں کچھ سرسرایا۔ اور ابھی وہ پوری طرح چونکنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ لمبا بارہ فٹا شیر کھد سے ان کے سامنے!

نہ انہوں نے ابھی کچھ سوچا تھا، نہ شیر نے کچھ فیصلہ کیا تھا، کہ اوپر جھاڑ سے دھم سے کوئی کودا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ ہوش میں آتے، انہوں نے دیکھا کہ ایک لمبا چوڑا آدمی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلہاڑی سے شیر پہ وار پہ وار کئے جا رہا ہے شیر اس اچانک حملے سے پہلے تو بوکھلایا، پھر صورتِ حال اس پر بھی واضح ہوئی اور انہوں نے دو شیروں کی وہ خوں خوار لڑائی اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ ان کے پسینے چھوٹ گئے۔

بڑی دیر بعد ان کے ہوش ٹھکانے آئے، وہ بھی اس طرح کہ کئی آدمی بیک وقت انہیں پکڑ پکڑ کر ہلا رہے تھے —— اور کہہ رہے تھے:

"سرکار شیر مر گیا!"

"سرکار، جمال خاں نے کلہاڑی سے شیر کو مار ڈالا بول کے!"

"سرکار... ..."

سرکار نے جیسے دنیا میں پہلی بار آنکھیں کھولیں، وہ زندہ بچ گئے تھے، اور صحیح معنوں میں ماں کے پیٹ سے گویا آج ہی پیدا ہوئے تھے۔

"شیر خاں، بول تیرے کو ہم نے کیا انعام دینا؟" بڑی دیر بعد وہ کہہ سکے ——

چھ ہاتھ کا لمبا چوڑا وہ مرد، شرمائی شرمائی سی ہنسی ہنس کر بولا: "سرکار، اللہ میاں آپ کو بچا دیا، اس سے بڑا انعام میرے کو ہور کیا ہوتا۔ بس میرے پاشا کو میں میرے ہاتھاں سے شیر کا نوالہ بننے سے بچایا، یہی اِچ میرا سوب سے بڑا انعام ہوتا ——"

یہ اتنی اتنی بات تو تھی نہیں، پورے موضع میں خبر پھیل چکی تھی۔ پورا موضع اُمڈ

پڑا تھا۔

"پھر بھی تُو منگ تو سہی، شیر خاں ـــــ"

"سرکار، آپ میرے کو شیر خاں اپنے موہنہ سے بول دیئے ـــ یہی اِج خطاب میرا سو ب سے بڑا انعام بن گیا ـــــ میرا نام جمال خاں ہوتا، سرکار۔"

آگے آگے لوگوں کے کندھوں پر جمال خاں، پیچھے بے حساب لوگ۔ اُن کے بیچ میں دُولہا بنے نواب سلیم ـــــ بارات جب جنگل چھوڑ آبادی میں پہنچی تو جمال خاں کے کچے گھر کے سامنے رُک گئی۔

چاندی کی طرح اُجلی اُجلی ایک گھبرائی ہوئی لڑکی، بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی اور جمال خاں کی گردن سے جھُول گئی۔

"اللہ میں مر گئی جی! تم کو کچھ ہُوا تو نئیں؟"

"اَگے بچھو ہٹ، چھوکری ـــــ گیلے کپڑوں سے آکو لپٹ گئی! اس کے زخماں میں پانی داتی بھر گیا تو بن ناحق کی مصیبت۔ پہلے حکیم صاحب کو دیکھنے دے اِس کو۔ چپٹ اُچک اُچک کو گلے پڑ رئی اس کے۔" ایک ادھیڑ عمر کا مرد بولا۔

"حکیم صاب اس کی بیوی ہوتے کیا؟" وہ تیزی سے بولی اور پھر جمال خاں سے لپٹ پڑی۔ "ہور گیلے کپڑے ہوئے تو کیا ہوا؟ اللہ میاں میرے گیلے کپڑوں کو اِج مرہم بنا دیں گے۔ چلو ہٹو، کہاں سے آئے بڑے!"

اب سب نے اس کی بے پناہ طراری اور محبت دیکھ کر جگہ چھوڑ دی اور پہلی بار نواب سلیم کو نظر بھر کر اسے دیکھنے کا موقع ملا۔

عورت کے حُسن اور جسمانی رعنائیوں کی یہ شاعر اور ادیب کیا تعریفیں کریں گے بھلا ـــــ وہ تو عورت کا سراپا خود اپنی تعریف کر دیتا ہے۔ اور جو سچ پوچھو تو عورت کے بھرپور حُسن کی صحیح تعریف تو یہ ہے کہ بے لباس ہو کر وہ خود کھڑی ہو کر

اپنے پیروں کی انگلیاں دیکھنا چاہے کہ انگلیاں اسے نظر نہ آئیں۔ بیچ میں اونچی اونچی پہاڑیاں نظروں کا راستہ روک دیں۔ اور پھر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ جسم کا ململ کا بھیگا ہوا، چپکا ہوا کرتا ہو، ادھر پنڈلیوں پر کسا ہوا چست پاجامہ ہو۔ ایک بات اور۔ غصّے، محبت اور دوسرے ڈھیر سارے ملے جلے جذبات سے چہرے کا گورا رنگ تپ کر سُرخ ہو گیا ہو۔ اور آنکھیں شرارے برسا رہی ہوں۔ اور قسمت سے اُن بولتی ہوئی آنکھوں تلے کا جل بھی پھیل گیا ہو۔ اور چھوٹے چھوٹے سُرخ سُرخ نتھنے پھڑکاتی ہوئی ناک میں چاندی کی چھوٹی سی لشکارے مارتی ہوئی لونگ بھی ہو۔ اور گھنے گھنے کالے بال کمر سے کچھ لپٹ گئے ہوں، کچھ آگے پیچھے جھول گئے ہوں۔ اور وہ بار بار اُچک اُچک کر اپنے تپتے ہوئے، لَو دیتے ہوئے بھیگے بھیگے جسم سے اپنے مرد کو لپٹ لپٹ جاتی ہو۔ ایسے میں تو اچھے خاصے شادی شدہ، بیوی سے محبت کرنے والے شوہروں کا، اپنی اپنی بیوی کو طلاق دے دینے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

لیکن نواب سلیم پر اس کا اُلٹا ہی اثر ہوا۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے خود کو گالی دی۔ ہم گدھے کے بچے! بڑے تیس مار خاں سمجھ لے کو بیٹھے ورہے ہیں اپنے آپ کو۔ گھوڑی ہو یا عورت، ٹانگوں تلے تو ایسی اچ طراری بتانے والی ہونا۔"

انعام کے طور پر نواب سلیم دونوں میاں بیوی کو موضع سے اپنے ساتھ حیدر آباد اپنی حویلی پر لے آئے ــــ جتنی محبت نواب سلیم نے شادی کے دن سے لے کر اب تک اپنی دلہن سے کی تھی، اور وہ جس پر نازاں بھی تھے، اُتنی محبت تو ان دونوں نے موضع سے حیدر آباد آتے آتے راستے میں ہی کر ڈالی تھی۔ نواب سلیم کچھ خجل ہو گئے، اور اس سے بھی زیادہ جل گئے۔ کچھ یہ بھی ندامت تھی کہ زندگی میں شیر تو بہت مارے، شیرنی ایک بھی نہ مار سکے!

حویلی پہنچ کر نھرو کو انھوں نے زنان خانے میں بھجوا دیا۔ اچھا نہیں لگتا تھا نا

کہ اتنے دن اتنی شرافت سے گزار دیئے اور اب پر پُرزے نکال رہے ہیں۔ انسان کو ذرا سے صبر اور بہت سی عقل سے کام لینا چاہیئے۔

مہرو نے تو آتے ہی دُلہن پاشا کے دِل میں گھر کرلیا۔

'ایو پاشا، اتنی سردی میں نہا رئیں! نکو نہاؤ۔ جوانی کے گناہ اللہ میاں میرے معاف کردیتے ــــ" اور وہ شرارت سے ہنس پڑتی۔

"نکو پاشا، پاناں آپ کائے کو نہالے رئیں! میں مرگئی کیا؟ اُجاڑ کتھے کے لال واغاں اتنے خوب صورت ہاتھاں پو پڑ گئے تو جلدی نئیں چھٹیں گے۔"

"پاشا، آج سردی بہوت ہے۔ دیکھو، آپ کے پائنیتی دو دو رضائیاں رکھ دی ــــ" پھر شرارت سے مسکرا کر کہتی: ہور سچی پوچھو تو رضائیاں کی ضرورت بھی کیا ہے بول کے؟" "ایو دُولن پاشا، کائے کو تو بھی چھوٹے سرکار کو جناب صاب (مولوی صاحب) کے پاس پڑھنے کو زبردستی بھیج رئیں۔ اُنوں اُن کی ڈاڑھی سے ڈرتے جی ــــ میں پڑھا دیوں گی ــــ"

دُلہن پاشا کو اس کی اس خوبی کا تو علم ہی نہیں تھا ــــ "اچھا، تو پڑھی وی بھی ہے؟"

"جی ہو پاشا، میں پورے تو جماعتاں پڑھی۔ یہیں اِچ اپنے کوٹلے سے۔ پھر باوا شریف لڑکا دیکھ کو شادی کردئیے تو موضع کو جانا پڑگیا۔ نئیں تو میں حیدرآباد کی اچ رہی وی۔ یہیں اِچ لکھی پڑھی۔ قرآن شریف پڑھی، حدیثاں پڑھی۔ پھر مدرسے میں بٹھائے تو اُردو بھی آگئی ہور حساب کتاب بھی۔ نماز بھی آتی میرے کو"

"پھر پڑھتی وی تو دِکھتی بھی نئیں تو۔"

چہرہ لال انار ــــ "اَئی پاشا، اُنے مہلت اِچ نئیں دیتیا۔ سچی بول رئی آپ کے طرف سے کام دھام کرکو کوٹھری میں گئی نئیں کی بس ــــ" وہ چہل چہل کرتی

ہنسی سے چہرے کو منور کرکے کہتی : اب کِتّا نہاؤں پاشا ؟ پھر اُجاڑ بالاں دیکھو نا ـــــ کتنے گھٹ ہیں ۔ پھر توبہ توبہ کرکے بولتی ـــــ "اللہ میاں میرے ، معاف کرنے والے ہیں ، پن صبوں کی نماز خضا اچ سہی ، ضرور پڑھتی پاشا میں ..... "

یہاں دلہن پاشا اپنا پلڑا ذرا ہلکا پڑتا دیکھ فوراً کہہ اٹھتیں : "ہو بس انوں بھی ایسے اچ ہیں ۔ اتے سالاں ہوگئے شادی کو ، انوں کو روز روز وونی مستی سوجھتی ـــــ انوں بھی تیرے مرد کے ویسا پیٹ پن میں بھی نئیں چھوڑتے تھے ۔ ہو ـــــ "

دونوں کو یوں سر جوڑ باتیں کرتا دیکھ کر نواب سلیم کو ایک اندرونی تسکین سی ملتی ۔ خوشی کو دبا کر ، ناراضگی چہرے پر بکھیر کر وہ دلہن پاشا سے کہتے ۔ "اب آپ کا سارا وخت تو اس پوٹّی کے ساتھ اچ گزرتا ۔ ہم تو گئے تیل لینے ـــــ "

وہ مُسکرائیں ۔ "ایسے بے کار باتاں نکّو کرو آپ ۔ آپ بولے تو شوہر ، جان سے بڑھ کو ۔ وہ کاں آپ کاں ۔ وہ زمین سے بھی نیچو ـــــ آپ آسمان سے بھی اوپر ـــــ ہو یہ ہے پن ، کی اپنے ہے بہوت بھی پیاری ۔"

"ارے اِتّی اُتّی پیاری ! کلیجے میں رکھنے کے لائخ ہے ۔ کُتّی !" نواب سلیم دل ہی دل میں کہتے ۔

ایک تو شادی کے بعد سے وہ اپنی دلہن کے دیوانے مشہور تھے (اور تھے بھی) ، پھر کبھی کسی پر نگاہ ڈالی بھی نہیں ـــــ اور اب دلہن پاشا کی خاص نوکرانی سے جو غصّہ کا اظہار وہ بار بار کر چکے تھے تو ان کے حساب اب معاملہ پورا چوکس ہو چکا تھا ۔

حویلی اتنی بڑی تھی کہ مردانے سے زنانے تک آواز پہنچانے کے لئے دربان چاؤش بھونپو استعمال کرتے تھے ۔ ویسے تو چلّاتے چلّاتے مرجاؤ ، مگر آواز اُدھر سے اِدھر نہ جاتی ۔ شیر خاں ڈیوڑھی کے مردانے ہی میں رہتا ۔ برائے نام کام تھا ۔

صحت اور بھی نکل آئی تھی - خطاب پاکر وہ بے حد مسرور تھا - اتنے بڑے نواب ہزاروں کا آنا جانا تھا ـــــ یہ معمول بندھ گیا تھا کہ دن بھر میں وہ کئی بار بڑے نواب صاحب کی خدمت میں بلُوایا جاتا ـ وہ بڑی خوشی اور فخر سے اپنے دوستوں کو سُناتے :

" یہی اِچ ہے وہ چھوکرا ـــــ اپنے 'موسم' موضع کا ـــــ سلیم پاشا کو شیر سے بچایا انے ـــــ ہور کلہاڑی سے مار بھی ڈالا ـــــ "

نوابوں کے دِل سدا ہاتھوں میں، اور ہاتھ سدا جیبوں میں ـ روز روپیہ دو روپیہ، کبھی اشرفی تک جمال خاں کو انعام میں مِل جاتی ـ

" اب تو بھی ایک دِن نواب بن جاتا ـــــ اِتی دولت تیرے پاس جمع ہوتی جارئی ـــــ "

" میں نباب کب نئیں تھا ؟ " وہ فخر سے ہنستا ـ " تیرے جیسی سونے کی اشرفی میرے پاس تھی ـــــ حیدر آباد میں ایک بھی نباب میرے اَتا امیر نباں نئیں تا ہور پھر تو اِتی پڑھی بھی، تیرے کو اللہ میاں میرے کچھ نئیں دِئے، میرا تو گھر بھر دِئے "

" دیکھو جی، اللہ میاں میرے، میرے کو کیا دِئے، کیا نئیں دئے، یہ میرا معاملہ ہوتا ـ تم بیچ میں مکو بولو ـــــ میرے اتی نصیبے والی، بھاگ بھری تو پوری دُنیا میں کوئی عورت نئیں ہوئیں گی ـ اِتا پیار کرے تُم کی آنچ میں مر گئی تو میرے کو ذرا بھی غم نئیں ہوئیں گا ـ اللہ میاں میرے، جی کھول کے خوشیاں دِئے میرے کو "

اللہ میاں کو اس نے اپنی 'پرسنل پراپرٹی' بنا کر رکھ لیا تھا ـ ہر بات میں دا اللہ میاں میرے ' تھے ـ

لیکن اس دن جب ان دونوں کی کوٹھری میں رات گئے بندوق تانے سلیم نواب آئے اور جمال خاں کی چھاتی پر بندوق تان کر سامنے کے سامنے تین بار اس سے مہرو کو

طلاق دلوا دی تو مہرو ایک بار بھی بیچ میں ’اللہ میاں میرے‘ کو نہ لائی ــــ بلکہ زبردستی بیچ میں پڑ کر نہ صرف یہ کہ طلاق دلانے میں مدد کی، بلکہ جاں بخشی بھی کرالی ــــ اور نواب صاحب اسے واپس زمینات پر بھجوا رہے تھے تو احسان بھی اس کے یاد دلائے "آپ پاشا دیکھے نئیں کتا کام کا آدمی ہے، کیسی آپ کی جان بچایا سو؟"

جمال خاں نے بے بسی سے بس اتنا ہی سوچا "کیسی عورت ہے اِنے؟ اِتی اللہ والی بنتی تھی۔ ہر بات میں اللہ میاں میرے، اللہ میاں میرے ــــ آج اللہ کو اِچ بھول گئی ــــ سچی بات ہے پیسے میں بھوت طاخت ہے ــــ نباب صاب کی باندی بن کو جتی دولت ملیں گی اُتی تو میری بیوی بن کو بھی نئیں ملی۔"

جمال خاں اسی کوٹھی کے پچھواڑے میں منتقل کر دیا گیا اور مہرو کو زنانے اور مردانے کے بیچ میں ایک خوب صورت سے کمرے میں سجا دیا گیا۔ اسی رات نواب سلیم اس کے پاس آئے۔

عورت کو اللہ نے ایک خاص حس دی ہے، جس سے وہ مرد کے دِل کے اندر کے اندر والے حصے میں بھی پہنچ سکتی ہے۔ بظاہر غصہ کرنے والے مرد زیادہ ہی بزدل اور لالچی ہوتے ہیں۔ یہ بات وہ شروع گھڑی سے ہی سمجھ رہی تھی کہ نواب صاحب وہ نہیں جو اوپر سے نظر آتے ہیں۔

"یاد رکھو، کبھی دولن پاشا کو بولی تو کی ہم تیرے مرد سے تیرے کو طلاخ دلائے ہور تیرے کمرے میں آئے بول کے ــــ"

اس نے اپنی چنگاریوں بھری آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا ــــ صرف دیکھا بولی کچھ نہیں۔ وہی کہے گئے: "ہور ہم میاں بی بی کا پیار، محبت ہور وفاداری اِتی مشہور ہے کی کوئی تیرا یخین کرنے والا بھی نئیں۔"

وہ اپنے چاندی کے بٹنوں سے کھیلتی رہی

"ہور اب ہمارے پاس آجا —"، وہ ہونٹ چاٹ رہے تھے۔

"اتنے سے کھیل کے واسطے طلاخ کا تماشا کائے کو تو بھی رچائے آپ؟"

وہ تیکھی نظروں سے انہیں گھور کر بولی:

"ہم مرد ہئیں — ہم کو مرد کے دل کا حال معلوم — طلاخ ہوئے بعد سے مرد کو خواہ مخواہ عورت پو غصہ آتا، ہور وہ پھر عورت پو کچھ بھی گذر رو، محسوس نئیں کرتا — یہ سمجھ کی ایک طرح سے خطع تعلخ ہو جاتا۔ ہور پھر تیرے سے شادی کرنا ہے بول کو طلاخ تو ضروری تھی — پن ذرا چھپا کو بعد میں کریں گے۔"

وہ پھر لاتعلقی سے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔

"جب طلاخ اِتّے شد و مد سے دلاتے آپ تو مذہب کے دوسرے احکاماں پو بی عمل کرنا پھر —"

"مطلب تیرا؟ وہ ذرا غصہ سے بولے۔

"مطلب یہ کی پھر میرے عدّت کے دِناں بھی پورے ہو جانے دیو آپ" وہ تیزی سے بولی۔

"بے وقوف ہے کیا چھوکری تو!" وہ اب پوری طرح تپ چکے تھے۔ کبھی کبھی عورت کی تیزی مرد کو اک دم سرد کر دیتی ہے اور کبھی کبھی یہی تیزی سارے بندھ توڑ کر اسے بہالے جاتی ہے — وہ اُٹھے اور لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا — "ہاتھ مکّو لگاؤ — میرے کو پھولاں آئے ہوتے ہئیں۔"

"اچھا!" نواب سیم ذرا مسکرا کر بولے — "تو کیا آپ پو دا ہئیں کی آپ کو پھولاں لگتے؟"

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور کمر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر غصہ سے بولی : "ہر عورت پودا ہوتی، ہور اس پہ پھولاں آتے ـــــ شادی کو اتنے سالاں ہو گئے آپ کے، اتّا نئیں معلوم ؟"

نواب سلیم سر کھجانے لگے ـــــ "ہم نا واقعی نہیں معلوم ـــــ"

وہ ذرا آواز دبا کر بولی : "میں ویسی ہو گئی ـ"

"کیسی ہو گئی ـــــ ؟" جواباً وہ اسی انداز سے بولے ـــــ

"اَگے کیسا سمجھاؤں ـــــ میں ...." ایک دم وہ غصہ سے بولی۔ انداز منکر نکیر والا تھا ـــــ آپ کون ہوتے ـــــ ؟"

"مسلمان ـــــ" وہ گھبرا کر بولے۔

"کس کے بندے ہیں ـــــ ؟"

"اللہ کے ـــــ" وہ اب بھی کچھ سمجھنے سے قاصر تھے ـــــ

"ہور کس کی اُمّت ہیں ؟" اُس نے بگڑ کر پوچھا۔

"حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ـــــ"

"ہور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پو کون سی کتاب اُتری ؟" وہ بڑے ادب سے پوچھ رہی تھی ـــــ

"قرآن شریف ـــــ"

"تو جب مسلمان ہیں، اللہ کے بندے ہیں، حضور کی اُمّت ہیں تو قرآن شریف پڑھے ہوئیں گے نا، ہور یہ بھی معلوم ہوئیں گا کی اللہ میاں میرے، بولے کی عورت ناپاک رہے تو اس کے پاس نکو جاؤ ـــــ حرام کام ہوتا اِتّے ـــــ"

"تو تمے اِتّا گھما کو کائے کو بول لے رئیں باوا ـــــ" وہ ذرا چاپلوسی سے بولے ـــــ پھر سر گھما کر کہنے لگے : "پن یہ آفت آئی کب ؟"

"آج اِج ۔" وہ بڑی ادا سے شرما کر بولی۔

"مطلب یہ کی پورے سات دِناں مرتے رہو سلیم ——"

"وہ آپ کے نصیباں —— میں کیا کرے سکتی ؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔

انھوں نے ہونٹ چاٹتے ہوئے اسے دیکھا۔ "سمجھ لیں گے۔ خالی سات دِناں کی تو بات ہے نا ——"

وہ جانے کے لئے اُٹھے۔ دروازے سے نکلتے نکلتے مڑ کر تہدیدی انداز سے بولے: "یاد رکھ جو شیر خاں سے ملی تو —— اب اتنے تیرے پو ہور تو اس پو حرام ہو گئے۔"

"ہور یہ سب تو بڑے جائز کاماں ہو رئے نا ——" اُن کے جانے کے بعد وہ دانت پیس کر بولی۔

جس دن مہرو پاکی کا نہانا نہائی، ایسا حسن ٹوٹ کر اس پر برسا کہ مردوں کی رال تو اس پر ٹپکتی ہی تھی، عورتیں بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کھانے لگیں۔

"اللہ کے واسطے اِتی اچھی مت لگ۔"

اس کے گھنیرے سیاہ بال۔ بالوں کے بیچ سے جھانکتے گلابی گلابی گال۔ کاجل سے بھری یہ موٹی موٹی شرابی، یا شرابی بنا دینے والی آنکھیں۔ کالے کُرتے میں سے بپھرتے ہوئے کبوتر۔ بے حد تنگ پاجامے، جیسے بدن تڑخ رہا ہو۔ قیامت کا ذکر، لوگ کتابوں میں پڑھتے چلے آئے تھے، اس دِن دیکھ بھی لی۔

"آگے دیکھ بول رہوں، اللہ کے واسطے اتی اچھی مت لگ ——" دُلہن پاشا نے اسے چھیڑتی ہوئی کہا: "نئیں تو میرے میاں اِج تیرے پو عاشق ہو جائیں گے ——"

"انوں تو ہو بھی چکے —" مہرو نے بے حد اطمینان سے کہا۔
مذاق میں کہہ جانا قطعی اور بات ہے۔ لیکن وہ دلہن پاشا تھیں، اس لئے مذاق کا حق بھی رکھتی تھیں۔ مگر ایک دو ٹکے کی چھوکری کا ایسا جواب سننے کی وہ بالکل روادار نہ تھیں — لمحہ بھر پہلے کا ان کا مذاق سے بھرا لہجہ فوراً تلوار بن گیا زہر اگلتی آواز میں بولیں: "چھنال زادی! عقل ہے کی نیئں؟ کس کے بارے میں بول رئی، کس سے بول رئی، ہور کیا بول رئی؟"
"نواب زادی — عقل بہوت دے اللہ میاں میرے — میکو۔ کس کے بارے میں بول رئی۔ کس سے بول رئی؟ تو آپ سے بول رئی۔ ہور کیا بول رئی؟ تو اب سے بولیتوں، غور سے سنو آپ کے دولہے میاں، سلیم نواب میرے پو عاشق ہوگئیں، ہور آج رات کبھی آپ میرے کمرے میں، میرے پلنگ پو، ہندیرا کر کو آکو سو کو دیکھو تو پتہ چل جائیں گا کی میں جھوٹ بول رئی کی سچ —" اور وہ اپنی بات کا ردِعمل دیکھنے خاموش ہو گئی۔
"تیرے کمرے میں، تیرے پلنگ پو، ہندیرا کر کو میں کیوں سوؤں بھلا؟" وہ غصے سے بولیں۔
"اس واسطے کی ظاہر ہے کی آپ کے میاں میرے لالچ میں میرے اچ کمرے میں میرے اچ پاس آئیں گے نا؟ کبھی آپ میرے بستر پو رہے تو ہندیرے میں انوں کو کیا معلوم پڑیں گا کی میں ہوں کی آپ۔ پن آپ کو تو پتہ چل جائیں گا کی میرے کمرے میں آنے والا میرا نئیں، آپ کا مرد ہے۔"
اپنی محبت کے نشے اور غرور میں چور، دلہن پاشا بولیں "پن اتا بول کی کبھی ایسا نئیں ہوا — یعنی میرے میاں تیرے کمرے میں نئیں آئے تو؟"
"تو آپ میرے کو یعنی کٹوا کو حویلی سے جوتے چپلاں مار مار کر نکلوا دینا۔

ہو رہیں بیچی رہی تو میرے مرد کے سنگات عزت سے بجھا دینا ـــــ"

رات کو سولہ سنگھار کر کے، مہرو جمال کے پاس پہنچی ـــــ وہ اس کے رویّہ سے بہت دل برداشتہ تھا۔ کچھ نہ بولا۔

"آج تمنا ایک تماشا تیانے کا ہے ـــــ ذرا میرے کمرے تک چلو"

وہ جھجکا ـــــ نباب صاب...."

"اگے چلو جی ـــــ" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے بولی ـــــ

"ایسے نباب ایک پائی کے پندرہ بِکتے ہیں"

جمال حال کو مہرو نے باہر کی دیوار کے پاس لے جا کر وہیں رُکنے کو کہا۔ اندر دُلہن پاشا اندھیرا کر کے، چراغ کی لَو اتنی نیچی کر کے کہ شکلوں کی پہچان ناممکن تھی مہرو کے بستر پر لیٹی تھیں، اُسی کے کپڑوں میں ـــــ اور مہرو خود اندر والے کمرے میں کھڑی رہی۔

رات کا سناٹا اور گہرا ہوا تو باہر کسی کے قدموں کی ہلکی ہلکی، ڈری، سہمی چاپ اُبھری۔ پھر دروازے پر ہلکی سی دستک دی گئی۔ چرچراتا ہوا دروازہ بغیر کسی مشکل کے کھُل گیا۔

پھر سلیم نواب دھیرے دھیرے آگے بڑھے۔ پلنگ کی پٹی پر بیٹھتے ہی اُنہوں نے اپنے بے قرار ہاتھوں میں کبوتروں کی جوڑی پکڑلی اور ہونٹوں سے ہونٹ مِلا دِئے۔

دھیرے دھیرے دُلہن پاشا نے ہاتھ بڑھا کر چراغ کی لَو تیز سے تیز تر کر دی اور بے حد جھکا جھک روشنی میں دونوں نے ایک دوسرے کو بے حد غور سے دیکھا ـــــ

"ہم ــــ ہم ــــ ہم . . . . . ." وہ ہکلانے لگے۔

پچھلے کمرے سے مہرو نکل کر آئی۔ حیران سی ہو کر بولی: "ہم ــــ؟ آپ کو اردو خواعد نہیں آتی کیا؟ آپ کو معلوم نہیں 'ہم' دو کو بولتے، ہور آپ تو اکیلے ہیں۔" پھر دُلہن پاشا پر نظر ڈال کر بھرپور بناوٹی حیرت سے بولی: "ایو ــــ آپ بھی ہیں کیا؟ جب ہی سرکار ہم، ہم کرتے رئیں ــــ" وہ ہنسی۔ "مگر میری غریبنی کی کوٹھری میں آپ لوگاں کیسے آگئیں؟ خدا کی شان!"

دلہن پاشا تنتنا کر اُٹھیں ــــ "اُٹھ!" اُنھوں نے نواب سلیم کو حکم دیا۔

نواب سلیم گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"بولو: میں نواب سلیم یار جنگ، اپنی بیوی گل بدن بیگم کو تین بار طلاخ دیا۔

"طلاخ!

"طلاخ!

"طلاخ!"

نواب سلیم کچھ جھجکے تو وہ پوری طاقت سے چلائیں: "بولتے کی بلاؤں ابا حضور ہور امّی حضور کو؟ ہور یہ بکھو سمجھو کی میں تمہارے ٹکڑوں پو پلنے والی مخیر نی تھی ــــ تمہارے جیسے دس نواباں میرے باوا جان کے آگے کا جھٹا کھا کو ہور ان کی اُترن پہن کو زندگیاں گذار سکتے ــــ سمجھے؟"

طلاق سے نپٹ کر وہ مہرو سے بے حد مہربان لہجے میں مخاطب ہوئیں:

"جا، ہور اپنے مرد کو بلا کو لا۔"

مہرو تیزی سے نکلی اور جمال خاں کو لے آئی، جو وہیں دیوار سے لگا کھڑا تھا ــــ

اُنھوں نے اپنے، سونے سے لدے جسم سے ایک ایک کر کے سارے زیور

اُتارے اور مہرو کے دوپٹے میں پوٹلی بنا کر اسے تھما دیے۔

"تو میرے آنکھاں کھول دی ——" پھر جمال کی طرف دیکھ کر بولیں:

"بڑا نصیبے والا ہے تُو —— ایسے وفا کے پُتلیاں کسی کسی کو ملتے —— جاؤ، اللہ تُم لوگاں کو خوش رکھے —— ہور اتنا اطمینان رے کو جاؤ کی تمہاری بیوی کے پیٹ میں تمہارا اِچ بچہ ہے ——"

ایک دم نواب سلیم نے کچا کھا جانے والی نظروں سے مہرو کو دیکھا۔

"حرام زادی! پیٹ سے تھی ہور ہم سے نایابی کا دھوکا کر کے بچ گئی!"

ان کی نظروں سے برستی گالیوں کو مہرو نے مسکرا کر پی لیا اور اپنے میاں کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئی۔

جمال خاں نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا "یہ —— یہ اِنے —— میرا ہاتھ..."

"کیا ہُوا تیرے ہاتھ کو؟" وہ ایک دم غصّہ ہو گئی ——

"وہ —— اُنے اپن تو طلاخ ہو گئی نا —— پھر اب پہلے حلالہ کرنا پڑیں گا نا ——" وہ رک رک کر بولا۔

زیور کی پوٹلی زمین پر پٹخ کر اس نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ لئے اور دانت پیس کر بولی "حلالہ؟ حلالہ کرنے والے کو حلال نئیں کر دیوں گی میں!"

"مگر —— مگر —— وہ..." جمال خاں پیچھے ہٹتے ہوئے بولا:

"یہ اِنے تو مذہب کا فتویٰ ہوتا —— بول کے"

"مطلب یہ کی ایک سانڈ سے تو جھوٹ سچ بول کو خود کو میرے واسطے بچانی ہور اب دوسرے کے سامنے جھتی پڑ جاؤں؟ وہ حملہ آور ہونے کے سے انداز سے جھپٹی۔ تیری شرم کدھر مر گئی رے؟ دوسرے کے ساتھ سوئی سو عورت کے ساتھ سونا تیرے کو پھر اچھا لگیں گا؟"

جمال خاں گھبرا کر سر بچاتے ہوئے بولا "مگر وہ خاصنی صاب اک دفع بولے تھے نا گاؤں میں . . . . . ."

"اگے چل گے، بڑا تو ہور تیرا خاصنی ——— میں سوب پڑھ لکھ کو بیٹھی۔ میرے کو اتا بول، اپنے مذہب میں کیا ہے کی اتے دِن کا فاقہ پڑ جاتے کی مرنے کی گھڑی لگ جاتے تو سوّر ہور مُردار بھی حلال ہو جاتا نا؟"

"ہو یہ تو میرے کو بھی مالوم۔" وہ منمنایا۔

"مگر کس وجہ سے؟" وہ گرجی ———

"مجبوری کی وجہ سے۔" وہ پھر منمنایا۔

"مطلب یہ نا کی مجبوری کی وجہ سے حرام چیز بھی اللہ میاں میرے حلال کر دئے ———"

"ہو ———"

"تو پھر جب مجبوری میں وہ ظالم تیرے سے زبردستی طلاخ دلوایا تو وہ بھی تو نا جائز ہوئی نا؟ سینے پو بندوخ تان کو کوئی کسی کی بیوی کو طلاخ دلائیں گا تو کیا وہ اللہ میاں کے پاس خبول ہوئیں گی؟"

جمال خاں بے چارے ہمیشہ اس بات پر شرمندہ رہتے تھے کہ ان کی بیوی ان سے بہت زیادہ قابل اور پڑھی بھی ہیں اور یہ کہ وہ اس کے مقابلے میں بے حد جاہل آدمی ہیں۔

"تیسرا مہینہ لگ گیا میرے کو ——— مالوم؟" اس نے جمال کا ہاتھ لے کر اپنے پیٹ کے اوپر رکھا۔ "سچی دُنیا کی کوئی بھی خسم کھلائے، اتنے پورا پورا تیرا بچہ ہے۔"

وہ شرم اور فخر کے ملے جلے انداز سے مسکرایا ——— زور سے اس کا ہاتھ

دبا کر بولا: "اتا خوش رکھوں گا تیرے کو اب —— چل۔"

"چل؟" وہ مسکرائی —— "ذرا ٹھیر —— ایک بھوت ضروری کام یاد آگیا۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی پھر اسے کمرے میں لے آئی۔ نواب سلیم دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، سر جھکائے ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ بے حد چبھتے ہوئے لہجے میں بولی: "نواب سلیم، جب ہیں مغلیہ تاریخ پڑھی تھی تو میرے کو نور جہاں اتی بڑی لگی تھی کی پوچھو نکو۔ چندر لشو رے بہاکو آتے مزے سے ہندوستان کی ملکہ بن کو بیٹھ گئی —— تم سلیم، میں بھی اتفاق سے مہرو —— ہور تمہاری شیر سے جان بچایا سو میرا میاں، جسے تم شیر خاں بولے، ہور جہاں گیر نے شیر افگن بولا تھا —— تم سمجھے ہوئیں گے کی چلو یہ بھی رو دھو کو میرے تخت کی رانی بن جائیں گی، ہور پھر گلاباں کا عطر ہور پاناں ہین کتھے کے ایجاداں کریں گی۔ پن تم غلط سمجھے، بھوت بھی بھوت غلط سمجھے —— میں ساری دُنیا میں خوشبو پھیلانے سے اچھا سمجھتی کی ایک اچ مرد کے دل کا گلاب مہکا کو رکھو، ہور سارے محفلاں میں لالیاں بکھیرنے سے اچھا ہے کی بس اپنے اچ آنگن میں بہار کے لالیاں بچھا کو رکھو۔

وہ اپنے لمبے چوڑے مرد کا ہاتھ خوشی اور فخر سے تھام کر بولی "لوگاں کتا غلط بولتے کی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی کتے۔ اب میرے کو ہور اس کو دیکھو، میں مہرو ہوں ہور مہرو اچ رہوں گی۔ ہور انے بھی میرا مرد اچ رہیں گا۔ میرے کو نور جہاں تبانے والا اس دُنیا میں تو پیدا نئیں کیا اللہ میاں میرے نے۔"

اور وہ ایک تیز جھٹکے سے جمال خاں کے ساتھ باہر نکل گئی۔

جمال خاں آج ایک بار پھر شرمندہ ہو گئے —— "میں اچ غلط سمجھ لے کو بیٹھا تھا۔ واقعی میری بیوی اللہ والی ہے —— کیا ہوتا جو ذرا سی تیز مزاج ہے اُنے!"

توبہ توبہ

رانیں جب انتہائی گوری ہوں، مکھن کی طرح چکنی ہوں، ملائی کی طرح نرم ہوں، بجلیوں کی طرح پھڑکتی ہوئی ہوں اور شلوار کا رنگ گہرا نیلا ہو اور پہننے والی اٹھارہ سالہ جوان لڑکی ہو، اور یہ منظر دیکھنے والا چھبیس ستائیس سالہ بھرپور جوان ہو تو ——؟

سمی نے نئی تراش اور جدید ترین فیشن کا لہریئے لہریئے والے پٹوں کا تنگ فراک تو اپنے جسم پر چڑھا لیا تھا اور جب تنگ پائنچوں والی شلوار سے دھینگا مشتی ہو رہی تھی کہ اچانک ریاض کمرے میں آن ٹپکا —— ایک لمبی سی، " اوئی " کہہ کر سمی نے اپنے آپ کو چھپانے ڈھکنے کی کوشش میں پاس پڑا ہوا نائلون کا دوپٹہ اٹھایا اور رانوں کے گرد لپیٹ لیا —— یہ منظر اور بھی توبہ شکن تھا —— کم بخت دوپٹہ بھی گہرا نیلا ہی تھا۔ یہ سمی نامراد کو کچھ خبط ہی تھا کہ میچنگ کرتے ہوئے کپڑے پہنے، گہرے ہرے، نیلے، اودے، دھانی، لال گلابی کپڑوں کے

ڈھیر اس کی الماریوں اور صندوقوں میں بھرے پڑے تھے۔ اور اب نیلے نیلے پیرہن میں دھڑکتا تڑپتا جسم لئے وہ "اوئی۔ اوئی" کرتی کھڑی تھی، مگر یہ سُدھ نہ ہو رہی تھی کہ بازو لٹکتے پردے کے پیچھے ہی چلی جائے۔ ریاض پہلے تو پلکیں جھپکا جھپکا کر یہ قاتل منظر دیکھا کیا، پھر جیسے ہوش میں آ کر چلنے ہی کو تھا کہ تمی تیزی سے بولی:

"اللہ رجو بھائی —— قسم اللہ کی بڑے بے حیا ہو۔ مٹلتے بھی نہیں یہاں سے۔ توبہ توبہ!" وہ جھوٹ موٹ اِترائی۔

اک دم ریاض پھٹ پڑا "میں بچہ نہیں ہوں جی جو مجھے رجو رجو کہتی پھرو! ہاں۔ میں. . . . ." بس اس کے الفاظ زبان پر ہی تھرک کر رہ گئے۔ "اور خبردار" وہ بڑی ہمت سمیٹ کر الفاظ چبا چبا کر بولا: "جو کبھی میرے سامنے توبہ توبہ کہا ہاں میں کہے دیتا ہوں جی تمی بیگم ——" اور ایک دم وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

"توبہ توبہ" وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا —— توبہ توبہ۔ اس توبہ نے تو میری جان لے لی۔ توبہ توبہ۔ ہونہہ؟ بڑی آئیں توبہ توبہ ——"

جیسے بادل اُڑتے ہیں، ایسے بہت سارے ماہ و سال پَر لگا کر اُڑے، اور اس منزل پر جا پڑے جب ریاض، رجو چھ سال کا تھا۔ کبھی ہنس کر بہتا، کبھی اس سے بھی بے نیاز ہو جاتا، کبھی تو بالکل ہی منگار ہتا —— کبھی موج میں آ کر تمیض ہی گلے میں لٹکا لیتا۔ اور ان دنوں وہ پورے گھر بھر میں کس قدر بے ضرر مانا جاتا تھا۔ اس قدر بے ضرر کہ منجھو باجی، جو کہ سارے گھر بھر کے بچوں سے بھی گئی گزری اور بدی تھیں —— نہانے کو بڑے دالان سے لگے بڑے سارے حمام میں جاتیں تو مارے ڈر کے اسے ساتھ لیتی جاتیں —— وہ اپنی نیلی پیلی گولیاں، ہرے لال کنچے ساتھ لے جاتا —— وہ نہاتی رہتیں۔ یہ اپنا کھیل کھیلے جاتا، پر اس دن الو

سے لڑائی لڑائی میں وہ سارے کنچے اور گولیاں ہار گیا۔ اور منجو باجی گرمی سے بوکھلا کر باتھنگ گاؤن اٹھائے حمام میں گئیں تو اسے خالی ہاتھ ہی پہرے داری کو جانا پڑا۔ (کم بخت منجو باجی۔ جانے کاہے کا ڈر لگتا تھا انہیں۔)

منجو باجی مل وَل کر نہاتی رہیں۔ اور وہ دیوار کی طرف موتہہ کیے بیٹھا رہا۔ پھر دیوار کو دیکھتے دیکھتے اس کا جی اوب گیا تو اس نے ذرا سی گردن پھیری —— باپ رے! وہ بھی منجو باجی کی طرح ڈرنے لگا —— مگر پھر ہمت سمیٹی۔ منجو باجی شاور کے نیچے کھڑی تھیں۔ دہکتی چمکتی گولائیوں پر سے پانی بھی جیسے سہم سہم کر جھجک جھجک کر گر رہا تھا —— سُنہری روپہلی چھوٹے بڑے موتی پھر بھی اُن کے ابھاروں پر اٹک ہی جاتے، اور پھر ان کے بہت، بہت، بہوت ہی لمبے بال ساری پیٹھ پر چھائے ہوئے تھے —— اور پھر موتی سہمے سہمے، بال بکھرے بکھرے، اور ان کی نرم اور ملائم جلد جو صابن کے رگڑے کھانے سے سرخ پڑ گئی تھی۔ اور پھر۔ اور پھر اُسے یہ منظر خدا کی قسم بہت ہی اچھا لگا —— بہت ہی اچھا۔ اُسے غصہ آنے لگا کہ اتنا سارا زمانہ وہ کنچے اور گولیاں کھیلتے یوں ہی بِتایا گیا —— اُلّو کا پٹھا ہیں —— اِک دم تولیہ لینے کو منجو باجی نے ہاتھ بڑھایا اور چہرہ بھی اِدھر کو پھیرا —— رنجو اپنی کنچوں جیسی آنکھیں کھولے، بنا پلک مارے، تصویر حیرت بنا قدرت کی داد دے رہا تھا —— تولیہ اپنے جسم کے اِرد گرد لپیٹتی ہوئی وہ ایک ادائے تبسم کے ساتھ بولیں: "توبہ توبہ!"

جیسے کسی نے اس کے گریبان میں سے برف کی ڈلی اندر چھوڑ دی ہو۔ وہ چونکا، اس بُری طرح چونکا کہ اس کا انگ انگ لرز گیا —— وہ جی ہار کر یونہی بیٹھ گیا —— منجو باجی غسل کا گاؤن پہن چکیں تو اسے اٹھاتی ہوئی بولیں: "رنجو ایسے کسی کو نہاتے ہوئے دیکھنا، یا ننگی عورت کو دیکھنا بہت بہوت بُری بات ہے۔

اب سے دیکھو گے ــــ؟" اس نے سہم کر منجو باجی کو دیکھا اور بڑی سعادت مندی سے دونوں ہاتھ گالوں پہ مارتے ہوئے کہنے لگا: "توبہ توبہ۔ اب چھے نئیں توبہ توبہ ــــ اب چھے نئیں توبہ توبہ ــــ" اور اس کی نگاہ جھکتی گئی، جھکتی ہی گئی۔

پھر کتنے ماہ و سال گزر گئے، کتنی برساتیں، کتنی گرمیاں، کتنے جاڑے گرمیوں کی ہر گزرتے والی رُت رجّو کو ایک سال بڑا پاتی۔ مگر گھر والے یہ بھی دیکھتے کہ کبھی تو رجّو نہانے کی خاطر دالان والے حمام کی طرف نہ پلٹتا ــــ اب ایسا بھی کیا پردہ تھا ــــ لڑکا بیس اکیس سال کا ہو بھی جائے تو اپنا ہی ہوتا ہے۔ جوان ہو جائے تو گھر سے نکال کر پھینک تو نہیں دیتے نا ــــ کبھی شادی بیاہ کے ہنگاموں میں مردانہ بالکل اٹا اٹ بھر جاتا۔ اور ایسے موقعوں پر کوئی رجّو سے کہتا: "میاں تم تو گھر والے ہی ہو، اپنے زنانہ حمام میں آکر نہالیا کرو نا ــــ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ غیر مردوئے گھروں میں جھانکتے پھریں۔" تو وہ سوچتا "توبہ توبہ"

ریاض بی، اے میں آیا ــــ لڑکیاں ایک سے ایک نکمی اور پڑھائی چھوڑ۔ اور ریاض نے تو اکنامکس میں وہ قابلیت دکھائی تھی کہ پروفیسر صاحب خود ایک دن ابا میاں کے پاس آئے تھے کہ چھوکرے کو لندن بھجوا ہی دیں ــــ جب کبھی کسی نے کہا کہ میاں ذرا لڑکیوں کو کچھ سکھا دیا کرو، کچھ بتانے سکھانے سے علم تو گھٹنے سے رہا۔

وہ سوچتا: "توبہ توبہ!"

شہر میں کبھی نمائش لگتی اور لڑکیاں اس کے سامنے آئیں تو اس تصور سے ہی اس کے پسینہ آنے لگتا کہ وہ شمّو، ٹمّو، الانی فلانی کے جمگھٹے میں کھڑا ہے۔

وہ سوچتا: "توبہ توبہ!"

گھر میں کوئی مہمان اُترتے، یا یہ خود کہیں ماں باپ کے ساتھ جاتا، تعارف کی نوبت آتی بھی تو اس کی جھکی جھکی نگاہ اُوپر اُٹھنے کا نام نہ لیتی۔

لڑکی کو سلام کروں؟ وہ سوچتا: "توبہ توبہ"

بی اے چھوڑ ایم اے پاس کر لیا، نوکری والا بھی ہو گیا —— بھر مٹھی روپے ماں کی گود میں بھی لاکر ڈالنے لگا —— لیکن شادی کی بات جب کبھی ماں نے، خالہ نے چھیڑی اس نے دل ہی دل میں سوچا: "توبہ توبہ!"

ریاض محمد عرف رجّو اس قدر خوب رُو تھا، اتنا دِل کش، یا پھر بقول سمّی اِتنا ہینڈسم کہ ایک گھڑی دیکھنے کی چیز: "اللہ رجّو بھائی اس قدر اسمارٹ ہیں، ایسے سپورٹنگ ہیں کہ بھئی پوچھو مت —— جانے وہ کیا سوچتے ہیں؟" لڑکیوں میں کبھی ریاض کا ذکر نکلتا تو بس اس کے حُسن پر —— سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ نمبر ایک کا مغرور ہے —— اپنے حسن کے غرور میں چور ہے۔ تبھی تو کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا —— ورنہ یہاں تو اکیو ایک "اسپورٹ" لڑکی موجود ہے پھر بھی بہنوں کا خیال تھا کہ اگر کبھی رجّو کی نظرِ انتخاب پڑی ہی تو سمّی پر ہی پڑے گی —— وہ نامراد دِن رات ہیروئن بننے کے خواب دیکھا کرتی —— کبھی تنہائی میں رجّو مل گیا تو کیا کرے گی؟ ہائے بات کرنی بھی نہ سُوجھے گی تب بھی رجّو بھائی کہے گی یا ریاض کہہ کر دَم سادھ لے گی؟ مگر قسم لے لو جو ریاض کا سایہ بھی اِدھر اُدھر کسی نے دیکھا ہو —— بس کمرے ہی تک اس کی دُنیا محدود تھی۔

وہ تو سمّی کے کمرے میں یوں چلا گیا کہ اُسے ہارڈی کا وہ ناول پورا کرنا تھا جو جانے کس جھونک میں سمّی اُٹھا لے گئی تھی —— اب بھلا اُسے کیا معلوم تھا کہ کتاب لینے کو جائے گا، اور وہاں —— توبہ توبہ —— وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا ——

اُدھر ثمی کو وقتی طور پر تو بڑی شرم آئی ـــــ "اے ہے اللہ آخر رجّو بھائی کیا سوچیں گے ؟ ایسے ہی بنا دروازہ بھیڑے کپڑے بدلا کرتے ہیں ! مگر انہیں حق بھی کیا تھا کہ کسی کے کمرے میں یوں چلے آتے ـــ ؟" اور ایسی ہی الگٹ پلٹ ہزار باتیں وہ سوچتی رہی ـــــ پھر یکایک جگنو کی مانند ایک خیال اس کے ذہن میں چمک اٹھا ـــ کیا ـــ کیا ـــــ وہ اب یہ نہ چاہیں گے کہ ان کی ہونے والی دُلہن بھی ایسی ہی گوری اور چمک دار ہو ـــ ؟

مگر رجّو نے تو کوئی نوٹس ہی نہ لیا ـــــ ثمی کی ٹانگوں کو تو اس نے اتنی بھی اہمیت نہ دی جتنی ایک بار بکری کی ٹانگوں کو دی تھی : نوکر خانے میں ایک دن ماماؤں کے پوتے ایک بکری پکڑ لائے تھے ـــــ اور سب مل کر اس کا دودھ دوہنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے اور بکری تھی کہ بس ٹانگوں سے پوٹوں کو جھاڑے جا رہی تھی ـــ رجّو کو بڑی ہنسی آ رہی تھی ـــــ اور وہ بڑے چاؤ اور انہماک سے دیکھ رہا تھا کہ بکری پچھلی ٹانگوں سے کس مزے سے دولتیاں جھاڑ رہی ہے ـــــ ہائے ! بیچاری ثمی بکری سے بھی گئی گزری ہو گئی ـــــ

ایسے موقعے پر جو ہوتا ہے وہی ہوا یعنی بالکل وہی ہوا کہ بیچارہ رجّو جو نہیں تھا وہ سمجھ لیا گیا ـــــ اور جو تھا وہ کسی نے نہ سمجھا ـــــ اور اب تو لوگ باگ رجّو میاں کی والدہ کی قسمت پر ترس کھانے لگے تھے کہ کس قدر خوب صورت سجیلا اور خوب رو پڑھا لکھا لڑکا اور ـــــ

ثمی بھی اپنی جگہ صبر کر کے بیٹھ گئی ـــــ اس بات سے کم از کم رجّو کو اتنا اطمینان تو ہوا کہ اب کوئی اس کے آگے شادی کی بات چھیڑتا ہی نہ تھا۔ وہ مزے سے آفس جاتا ـــ مہینے کے ختم پر ڈھیر سارے کپڑے سلواتا ، برل کریم لاتا ، بڑھیا پوڈر اور ٹائیاں لاتا اور بس مگن تھا ـــــ

مگر ایک دِن کیا ہُوا کہ رجّو نے آفس جانے کے لئے اپنی موٹر سائیکل نکالی۔ ابھی وہ جانے ہی لگا تھا کہ اسے یاد آیا کہ پین میں انک ڈالنی تو بھول ہی گیا ہے۔ وہ بجائے پورچ کے پچھلے زنانہ دروازے سے آنے لگا کہ راستہ نسبتاً چھوٹا تھا اور اسے جلدی جانا تھا۔ ٹائم کا وہ بہت ہی خیال رکھتا تھا کہ آفس دیر سے نہ پہنچوں۔ ایسے سے کیریر خراب ہوتا ہے ــــ وہ راہداری سے آنے لگا تو صنوبر جھاڑو دیتی جھپک جھپک اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہی تھی ــــ رجّو جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگا کہ کم بخت پین عین اس جگہ گِرا جہاں صنوبر کھڑی تھی ــــ وہ پین اُٹھانے کو جُھکا اور جب وہ دھیرے دھیرے اُوپر اُٹھا تو اس کے جِسم میں ننھے ننھے سنپولے سے رینگنے لگے ــــ اس کی ناک میں عجیب سی خُوشبو بھر گئی۔ یہ خُوشبو سَراسَر صنوبر کے جِسم میں سے آ رہی تھی ــــ مٹّی، دھُول اور پسینے کی مِلی جُلی خوشبو، اور ان سب سے زیادہ شدید خُوشبو تھی اس کے اپنے جِسم کی۔ جھاڑو لگانے سے اس کا جوان جِسم بھبھک اُٹھا تھا ــــ پسینے کے قطرے یہاں وہاں نمایاں ہو گئے تھے ــــ سیدھے ہاتھ کی آستین شانے کے پاس سے پھٹ گئی تھی ــــ اور گوندھی ہوئی سوجی کی رنگت کا مہکتا دمکتا گوشت جیسے رجّو کو زبان چڑائے جا رہا تھا ــــ رجّو اتنے برس کا ہو گیا تھا اس نے عورت کو اِتنے قریب سے نہ دیکھا تھا ــــ اور پھر یہ عورت ــــ؟ اسے دیکھ کر توبہ توبہ کہنے کو جی نہ چاہتا تھا ــــ یہ تو سات پردوں میں چھپی ہوئی عورت تھی بستر پر پلو، کمر تک بلاؤز، ٹخنوں تک ساڑی ــــ بس ایک شانے کے پاس کا گوشت تھا جو رہ رہ کر سُورج کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا ــــ سُورج کو مارو گولی جی ــــ وہ تو مست ہُوا جا رہا تھا اس خُوشبو سے جو بظاہر خوشبو نہیں تھی ــــ مگر دُنیا کے ہر عطر پر بھاری تھی۔

صنوبر جھاڑو لگاتی اس سِرے سے اُس سِرے پر چلی گئی۔ اس نے مُڑ کر

دیکھا تک نہیں، رجّو کا سارا وجود جلتے چولہے پر دھرا توا بن گیا — اس نے اپنی پوری طاقت سمیٹ کر پاؤں کمرے کی طرف بڑھائے اور عثمان کو آواز دے کر ڈوبتے لہجے میں بولا:

"عثمان میری موٹر سائیکل اندر رکھ دے۔ میں آفس نہیں جاؤں گا۔ میرا سر اچانک درد کرنے لگا —"

رجّو کو شرم تو بہت آئی، مگر اس نے اُسے طاق پر رکھنے میں بھلائی سمجھی اور اماں سے بالکل اسی لہجے میں شادی کی بات کہہ دی جیسے نئے سوٹ کا کپڑا خریدنے کی بات کہی ہو۔

"اماں آفس میں دوست احباب بہت مذاق بناتے ہیں، آپ میری شادی کردیجئے —"

اماں بے نصیب کو تو اس دن کی آس ہی نہیں تھی — انہوں نے چھوٹتے ہی سمّی کا نام پیش کر دیا۔ رجّو کو سمّی، ممّی، رجّی، پچّی — کسی سے غرض نہ تھی اسے بس عورت سے غرض تھی — ایک خوشبودار عورت سے، چھپی ڈھکی عورت سے!

رجّو جب دلہن کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ عطر، لوبان، پھولوں اور ہر طرح کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا — سجے سجائے پلنگ پر سمّی، ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی جو سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھی — جس کا ایک بال تک بھی نظر نہ آرہا تھا — "اچھا ہی ہوا جو یہ ڈھکی ہوئی ہے" رجّو نے عجیب بے معنی سی بات سوچی۔ اگر — اگر — مگر اس وقت وہ خود کو اگر مگر کے چکر میں ڈالنا ہی نہیں چاہتا تھا — کتے جیسے کچے گوشت پر لپکتے ہیں ایسے میں وہ پلنگ کی طرف لپکا۔ اور ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا۔ ایسی جان لیوا گرفت تھی کہ سمّی چوں بھی نہ کرسکی — مگر دوسری صبح ہر چند کہ وہ نڈھال نڈھال سی تھی — اُس کے چہرے کی جلد بتا رہی تھی کہ وہ سچ مچ ہیروئن بن گئی ہے۔

دوسرے دِن جب سمّی کی ذرا شرم ٹوٹی تو اس نے کنکھیوں سے رجّو کی طرف دیکھ کر پوچھا ــــ مگر پوچھنے سے پہلے اس کے دِل کو ذرا دھکّا سا لگا ــــ شادی کے دوسرے دِن کیا دولہے ایسے ہی چُپ چُپ اور روٹھے رہتے ہیں ــ ؟ جی کڑا کر کے وہ پوچھ ہی بیٹھی :

"آپ کو مجھ سے شادی کا خیال کیسے آیا ــ ؟" پھر تھوڑی دیر خود ہی رُک کر بولی : "مَیں سمجھ گئی ــــ آپ نے اس دِن مجھے بُری حالت میں دیکھ لیا تھا نا ــــ" اور وہ بالکل معصومیت سے ہنس دی۔ رجّو کو اس سے ایسے بیہودے سوال کی ہرگز توقع نہ تھی ــــ اور اگر ایسا ہی وہ ٹانگوں پر عاشق ہو جانے والا ہوا ہوتا تو رات بھر میں اس کی ٹانگیں خوناں خون ہو گئی ہوتیں ــــ مگر اس نے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی لائٹ آف کر دی تھی اور سمّی کی ٹانگیں تو کیا چہرہ تک بھی نہیں دیکھا تھا ــــ اور جو ہونا تھا وہ ہو ہی گیا تھا کہ یہ ہونا ناگزیر تھا ــــ مگر ــــ مگر اُسے ہر شے میں کسی شے کی کمی کیوں محسوس ہو رہی تھی ؟ وہ بے نام سی شے کیا ہو سکتی تھی ــــ کیا ــ کیا ؟

اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا ، وہ تو خواب میں بھی نہ سوچ سکا تھا ــــ اسے بڑی شرم آئی جب تھوڑے ہی دِنوں بعد سمّی نے اُسے بتایا کہ وہ باپ بننے والا ہے ــــ اسے یہ سب کچھ بڑا عجیب عجیب سا لگا اور کھوئے کھوئے سے پن کا وہ احساس کچھ ور بھی شدید ہوتا گیا ــــ سمّی شروع دِن سے محسوس کر رہی تھی کہ رجّو کچھ کھویا کھویا سا ستا ہے ــــ مگر کیوں ؟ وہ کبھی سمجھ نہ پائی۔ وہ اس کمی کو اپنے حُسن اپنے وضع وضع کے باسوں سے پُر کر دینا چاہتی تھی ، اور کرتی بھی تھی ــــ ویسے ہی اس کے پاس نت نئے تراش کے لباسوں کے ڈھیر تھے۔ مگر اُس نے اور بھی بڑھیا بڑھیا لباس سلوائے : کھُلے لے کے فراک ، نیچے گلے کے شرٹ ایسے گریبان کہ چاند سورج چمکتے نظر آئیں ، تنگ بلاؤز یسے کہ ہر ہر قوس اور دائرہ نمایاں ہو جائے ــــ سمّی ماڈل بن گئی ــــ سہیلیاں مذاق سے یں ــــ "فیشن پریڈ میں چلی جا ، فرسٹ پرائز نہ ملے تو ہم سے کہنا ۔"

اور اب سمی ماں بن رہی تھی "خوب صورت کپڑے پہننے والی ۔ نفیس میک اپ کرنے والی، چمکتا، لبھاتا سنگھار کرنے والی سمی ماں بن رہی تھی ۔۔۔ "یہ تو زیادتی ہے کہ میں اُسے بھرپور محبت نہ دوں ۔۔۔" وہ اُسے جاڑے گھمانے کو لے جانے لگا۔ پکچر لے جانے لگا، سیر کو لے جانے لگا ۔۔۔ سمی کو ذرا دکھ سا بھی ہوا: "بے نام و دکی ذات۔ اولاد کی آمد کے آثار نے ہی اتنا بدل دیا ۔۔۔ مگر چند دنوں میں سمی کو یہ سب کچھ بھی پھیکا پھیکا اور بناوٹی لگنے لگا ۔۔۔ لیڈی ڈاکٹر نے اُسے سیڑھیاں چڑھنے سے منع کر دیا۔ اور بھی "دوسری باتوں" کے لئے احتیاط بتائی تھی ۔۔۔ وہ تو ڈاکٹرنی نے کہا تھا، سو رجو عمل کر رہا تھا ۔۔۔ مگر پھر بھی سمی کو اس لمحے کی حسرت ہی رہ گئی جب کہ وہ ۔۔۔ سمی کو تو سوچتے بھی شرم آتی تھی ۔۔۔ مگر وہ کیسے اپنے دل سے چھپاتی؟ اس کی کتنی ہی سہیلیوں نے شرم اور فخر سے تمتماتے ہوئے چہروں کو سرخ سرخ دوپٹوں میں چھپاتے ہوئے بتایا تھا: "کوئی حد بھی ہوتی وحشت کی ۔۔۔ قسم اللہ کی! آستین تار تار ہو گئی تھی میری ۔۔۔"

"اللہ ہی سمجھے ایسے بے شرم سے، سارا لباس نچ گیا ۔۔۔"

سمی کا لباسِ عروسی ایسا بنا یا تھا جیسے ابھی درزی کے ہاں سے سِل کر آیا ہو ۔۔۔!

اور ایک دن رجو باپ بھی بن گیا ۔۔۔ میٹرنٹی ہوم کے بیس روپے روز والے کمرے سے نکل کر جب اس کی اماں نے سُنایا:

"رجو تجھے لڑکا ہوا ہے ۔۔۔" تو اُسے بڑا عجیب سا لگا کہ باپ بھی بن گیا۔ مگر لوگوں نے اس کا بچکانہ نام رجو نہ بدلا، پر نہ بدلا ۔۔۔ کتنا عجیب لگے گا کہ اس کے بچے کی موجودگی میں اماں اسے رجو کہہ کر پکاریں! یہ بہت غلط چیز ہے ۔۔۔ اُس نے جھلا کر سوچا بچپن کی یادوں کو بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہیئے ۔۔۔ میں اپنے بیٹے کا کوئی NICK NAME نہیں رکھوں گا۔ اُس نے بہت ہمت کے ساتھ جیسے ایک فیصلہ کر لیا۔

سمی بچے کو لے کر ہاسپٹل سے پلٹی تو زرد زرد سی تھی ۔۔۔ تھکی ہاری۔ پتہ نہیں

کاہے کی تھکن اسے گھیرے بیٹھی تھی ——— مگر اس کے چہرے پر نور سا چھا گیا تھا۔ یہ زردی اس زردی سے مشابہ تھی۔ جیسے چاند کے گرد زرد ہالہ ہو، رجّو کو تمی اب پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگتی تھی ——— اس کے حسن میں نکھار پیدا ہو گیا تھا ——— اس کے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات چیت کرنے تک کے انداز میں ایک وقار اور بانکپن پیدا ہو گیا تھا ——— وہ جب رجّو کی طرف پیٹھ کر کے بچّے کو دودھ پلانے بیٹھتی تو رجّو کو اس کے مُڑ مُڑ کر بات کرنے کا انداز بہت ہی بھلا لگتا ——— کیا عورت بچّہ پیدا کرنے کے بعد زیادہ خوب صورت لگتی ہے یا صرف اسی کو لگ رہی ہے۔

بچّہ بڑی جلدی جلدی بڑھ رہا تھا ——— پہلے جو کُرتے اسے ڈھانپ دینے کو کافی ہوتے تھے۔ اب اس کی ٹانگوں کو ڈھانپنے میں بھی ناکام رہتے تھے۔ بچّے کی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ تمی کے کام کاج میں بھی اضافہ ہو رہا تھا ——— کبھی تو مشین پر بیٹھ کر کھرر کھرر کپڑے سی رہی ہوتی ——— کبھی بچّے کے کپڑے دھوتی نظر آتی ——— کبھی وہ بچّے کو دودھ دینے کی فکر میں باورچی خانے میں نظر آتی ——— کبھی آنگن میں کپڑے سمیٹتی نظر آتی ——— رجّو اسے اپنی لگن سے کام کرتے دیکھ کر ہنس کر پوچھتا:

"تمی تم نے اپنے ذمّے اتنے سارے کام کیوں لے رکھے ہیں ——— ؟"

تمی مسکرا کر جواب دیتی: "اپنے بچّے کا کام خود کرنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے ———"

"مگر اس طرح تم نے خود اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے نا ——— کبھی تم سوچتی ہو کہ پہلے تم کس طرح ماڈل بنی پھرتی تھیں اور خوشبوؤں میں نہائی رہتی تھیں ——— !"

تمی کا حلق سوکھنے لگتا، جی چاہتا کہہ دے: تب بھی آپ نے کون جان نچھاور کر دی تھی مجھ پر ——— میں تو ایسے ہی نصیب لائی تھی کہ ساری خوشیاں

نصیب ہوتے بھی دل میں بے نام سی کسک پالا کروں ۔" خود رجّو نے بھی تو محسوس کیا تھا کہ وہ سمّی کو ٹوٹ کر پیار نہیں کرتا ـــــ اس کا کوئی انداز جان چھڑکنے والا نہیں کہلایا جا سکتا۔ وہ خود مجبور تھا۔ وہ ایسے جال میں پھنسا جو بظاہر جال نہ تھا مگر پھر بھی وہ نکل نہ پاتا۔

اس دن رجّو آفس سے لوٹا تو سمّی خلافِ معمول بُری طرح چڑی ہوئی تھی۔ آنگن میں ننھے نے خوب ساری مٹّی کا ڈھیر کیا ہُوا تھا اور ہر طرف کھلونے ہی کھلونے اور وہ خود اس مٹّی اور کچرے، دھول میں اٹا بالکل سا دھو مہاتما لگ رہا تھا۔ سمّی اپنے نصیب کو کوس رہی تھی ـــــ

"کنوارپن کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے خداوند ـــــ کوئی فکر نہ جھمیلا ـــــ یہاں تو کم بخت اٹھاتے گھونگھٹ ہی سے اولاد نصیب میں بندھ گئی سارے مزے ہوا ہو گئے ـــــ گو، موت کرو، جھاڑو جھٹاک کرو، نہلاؤ دھلاؤ، کچھ بھی کرو۔ مگر یہ حرام زادہ گندے کا گندہ ـــــ اگر پہلے سے ذرا بھی خیال آیا ہوتا تو ایسی شادی کو، ایسی زندگی کو دُور ہی سے سلام کر دیتی ـــــ"

وہ چڑ چڑ کر جھاڑو سے دھول اُڑاتی جاتی تھی، اور ننھے پر چڑتی جاتی تھی۔ ایک دم ریاض گھر میں داخل ہُوا، وہ چڑے جا رہی تھی۔

"کم بخت نصیبوں میں جو سوچا بھی نہ تھا وہ آگیا ـــــ کبھی کاہے کو جھاڑو تھامی ہوگی۔ یہ حرام زادہ مجھے کھا کر چین لے گا ـــــ"

رجّو ہنس کر اُسے چڑانے کو بولا: بس ایک ہی میں گھبرا گئیں ـــــ؟ خود ہی نے اسے بگاڑا ہے۔ یاد ہے کیسے کیسے چاؤ چونچلے تھے اس کے۔ ایک سال میں گالیوں تک نوبت پہنچ گئی ـــــ" اور وہ آگے بڑھا اور بولا: "لاؤ جھاڑو ادھر دے دو۔ ماشاءاللہ سے گھر میں بہت نوکر ہیں ـــــ تم ہی نے ہر کام اپنے ذمّے

لے لیا ہے تو اس کا کیا علاج ــــ؟"

سمیّ نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ اور خود بھی پرے ہٹ گئی ــ ہٹئے بھی
اب آپ جھاڑو کو بھی ہاتھ لگائیں گے!"

وہ جھاڑو والا ہاتھ پیچھے کر کے یوں ہی کھڑی رہ گئی۔ رجّو گرتے گرتے بچا ــ
اس کے جسم میں ہزاروں بڑے چھوٹے سنپولے کلبلانے لگے۔ ہمیشہ سجی سنوری
خوشبوؤں میں ڈوبی، بڑھیا لباس میں ملبوس رہنے والی سمیّ ایک پرانی دھرانی ساڑی
میں لپٹی کھڑی تھی ــــ بلاؤز کی آستین شانے کے پاس سے مسک گئی تھی ــــ گرد
سے بچنے کو اس نے پلو سر کے گرد لپیٹ لیا تھا ــــ جھاڑنے اور الجھنے کی وجہ سے
اس کے جذبات میں ابال سا آ گیا تھا اور گردن اور چہرے پر شبنمیں قطرے پھوٹ
آئے تھے۔ اور ایک خوشبو، جو خوشبو تھی بھی اور نہیں بھی ــــ اس کے جوان اور بھرپور
جسم سے نکل نکل کر رجّو کے نتھنوں میں ایسے پہنچ رہی تھی کہ ہر لمحہ وہ گر پڑنے کو ہو رہا تھا۔

وہ جیسے خواب میں بڑھا ــــ اس کے قریب ہو کر پھٹے بلاؤز میں سے جھانکتے
گوشت کو یوں دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ آستین میں سورج کیسے آ سکتا ہے؟

سمیّ تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ اک دم اسے اپنی ہیئت کا خیال آیا ــــ بڑے محجوب اور
شرمسار لہجے میں بولی: "میں نے صفائی کے خیال سے یہ پھٹے کپڑے پہن لئے تھے ــ
سوچا تھا جلدی جلدی جھاڑ جھوڑ کر کپڑے بدل لوں گی کہ آپ چلے آئے۔ آج تو آپ
وقت سے کچھ پہلے ہی چلے آئے۔ ہائے! مجھے کتنی شرم لگ رہی ہے۔ بھلا آپ کیا
سوچتے ہوں گے ــــ" اور وہ جھاڑو پھینک کر بھاگنے لگی۔

رجّو نے لپک کر اسے باہوں میں سمیٹ لیا۔ مدہوش کر دینے والی خوشبو کا
ایک ریلا اس کی ناک میں گھس گیا، اور وہ بالکل وحشیوں کی طرح سمیّ کو جھنجھوڑنے لگا ــ
کبھی وہ اس کے گال پر کاٹ کھاتا۔ کبھی ہونٹوں کو اس بری طرح چوسنے لگتا کہ سمیّ کو لگتا اس

کا دَم نکل جائے گا" توبہ توبہ!"

سمی ہانپ کر بولی "کچھ خیال تو کیجئے ——— آنگن ہے اور پھر ننھا ———"

رجّو نے دیوانوں کی طرح جھپٹ کر اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چپکا لیا۔ وہ ایک ایک کر کے اس کے کپڑے نوچ نوچ کر پھینکتا جا رہا تھا، دھول مٹی سے اَٹی سمی نے بڑی بے بسی سے کہا :

"توبہ توبہ رجّو ... ..."

مگر ریاض نے اُسے بات کرنے کی مہلت بھی نہ دی، اور اسے نوچتا کاٹتا ہوا بولا :

"مجھے آگے سے رجّو نہ کہنا۔ میں ریاض ہوں۔ تمہارا شوہر۔ میں بچّہ نہیں ہوں۔ مرد ہوں۔ سمجھیں نا؟ میں رجّو نہیں ہوں۔ اور میں جو چاہوں وہ کر سکتا ہوں ——— سمی میری جان ——— میری عورت ——— میری سات پردوں میں چھپی عورت ——— میں اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ تمہیں اپنے ہاتھوں ننگا کر سکوں۔"

سمی مارے شرم کے توبہ توبہ بھی نہیں کہہ سکی ——— اس کا شوہر ریاض اسے اتنی مہلت تو دیتا۔ اس کے ہونٹوں پر تو ہونٹوں کا ہی قفل پڑ گیا تھا

نتھ کا غرور

"اللہ اِنوں کچھ کرتے کیوں نہیں ——؟"

دُلہن خون کی طرح سُرخ سُرخ کپڑوں میں لپٹی لپٹائی، ملبے چوڑے سجے سجائے چھپر کھٹ پر سر نیہوڑائے یوں ہی بیٹھی کی بیٹھی تھی اور اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

"اللہ اِنوں کچھ کرتے کیوں نہیں ——" بار بار اُس کا دِل اس سے سوال پہ سوال کئے جارہا تھا۔

سُہاگ رات کے بارے میں اُس نے ایسی ایسی لرزہ خیز داستانیں اپنی سکھی سہیلیوں سے سُن رکھی تھیں کہ خوف اور ڈر کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا جوش و خروش بھی اس کی رگ رگ میں سن سنا رہا تھا ——

"اَیو کوئی کوئی دُولہا تو کتے سا کابوٹی کر ڈالتا ——" ایک بولتی ——

"اَئی چل ہٹ —— جیسی اس کی تو شادی اِچ ہو کر گئی ——" دوسری

اپنی رائے پیش کرتی ـــ "نئیں وہ، اب ایسا بھی نئیں ہوتا کی انسان جنور اِچ بن جائے ـــ"

"ہو میرے کو سب مالوم ہے ـــ شادی نئیں ہوئی تو کیا ہوا ـــ صابرہ بولی کتی نئیں کی اس کے دُولہے نے اُس کو گالاں ہور ہونٹاں پو خوب کاٹا تھا ـــ"

شادی سے پہلے سب سہیلیوں کی پلٹنیں جمع ہوتی تھی تو سر جوڑ جوڑ کر ایسی ہی بے سر و پا باتیں ہوتی تھیں ـــ لڑکیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں ـــ ایک جن کی شادی ہو چکی ہوتی ہے، وہ دُشمن بنانے میں ماہر ہوتی ہیں، اپنے ہی ساتھ کی سکھی سہیلیاں جب سُہاگ رات کی باتیں کرید کرید کر پوچھتی ہیں تو اُن میں ایک اکڑ سی آجاتی ہے ـــ اب جو غیر شادی شدہ ہیں انہیں اپنے دُولہے کے ساتھ گزاری راتوں اور روا رکھی باتوں کا حال کیوں بتایا جائے؟" وہ یوں ہی ٹال مٹول سے کام لیتی ہیں۔

"چل ہٹ بے شرم ـــ کچھ بھی نئیں ہوا ـــ ہور تیرے کو کیا ـــ کنواری ہو کو ایسے باتاں پوچھ رئی ـــ"

ایسی لڑکیوں کی اپنی ساتھ کی سہیلیاں ہی ان کی فوراً دُشمن بن جاتی ہیں ـــ

ایک دوسری قسم کی وہ لڑکیاں ہوتی ہیں کہ اُن کی بھی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ دُشمن بنانے میں زیادہ ہی ماہر ہوتی ہیں ـــ اپنی ساتھ کی کنواری سہیلیوں کو بن پوچھے ہی، ایسی ایسی باتیں بتاتی ہیں کہ وہ بے چاری ترسنے لگتی ہیں اور دل میں دُشمنی کی گرہیں پڑ جاتی ہیں ـــ

"اللہ سکو کیا بتاؤں ـــ اُنوں کے موچھیاں تھے ـــ نیچ آ کو پیار کرے تو بالاں ناک میں گھسے ہور ایسی زور کی چھینک آئی کی اُنوں کے امنی دروازہ ٹھوک کو پوچھنے لگے کی دولن کو سردی ہو گئی کیا ـــ ؟؟"

"دیکھو نا ـــ کتا اچھا نگوں کا جوڑا بری کے وخت چڑھاوے میں آیا تھا۔

اُجاڑ ایسے ہاتھاں دبا کو میرے کو بھینچے کی کتے سونا بائی چوڑیاں ٹوٹ گئے، ہور نگاں بھی گوٹاں کے کدھر کے کدھر ۔۔۔"

ہور تیرے کو مالوم ۔۔۔ ہمارا باوا جان کتا بولے کی ابھی لڑکی پڑھ رئی، گرمیاں کے چھٹیاں میں شادی دیں گے پن وہ لوگاں نئیں مانے ۔۔۔ ہور مالوم ۔۔۔ سردیاں میں اچ شادی لیئے ۔۔۔ ہور پہلی رات کو انوں ہنس ہنس کر میرے کو کیا بولے مالوم؟ بولے، گرمیاں کی شادیاں بھی اُجاڑ کوئی شادیاں رہتے کی گرمی کے مارے جاناں بوکھلا دے رہے ۔۔۔ سردیاں میں شادیاں کرے تو پاس میں گھس گھس کو سونے کا مزہ بھی آتا ۔۔۔"

اُس کی بھی دونوں قسم کی لڑکیوں سے بیک وقت دوستی، دشمنی، دونوں تھیں جنہوں نے جان بوجھ کر چھپانا چاہا، اُن سے بھی، اور جنہوں نے جان جان کر بتانا چاہا اور بتایا بھی، اُن سے بھی ۔۔۔ بہرحال اُسے یہ پتہ چل چکا تھا کہ سہاگ رات ہوتی ہے بڑے معرکے کی چیز ۔۔۔ اور یہ کہ وہ زندگی میں، عورت شریف ہو تو صرف ایک ہی بار آتی ہے ۔۔۔ اور اس کی شرافت میں کسے شک تھا ۔۔۔؟

مشاطہ جب اُن کے اوسط درجے کے گھر میں داخل ہوئی تھی تب ہی امّی نے اُسے فوراً اندر والے کمرے میں چلے جانے کا حکم دے دیا تھا۔

حیدرآبادی مشاطاؤں میں جو خاندانی ہوتی تھیں، وہ تو گھر والیوں کی چال دیکھ کر ہی چلن کا پتہ چلا لیا کرتی تھیں اور شریف نوابوں کے لئے حق نمک ادا کرتے ہوئے واقعی شریف خون چھان کر لاتی تھیں، ہاں جب کُٹنوں اور دلاّلہ قسم کی مشاطاؤں نے اپنا گھر بھرنے کی خاطر اس معزز پیشہ ہی کو بدنام کر دیا ہو تو الگ بات ہے ۔۔۔ لیکن جمیلہ بی مشاطہ نے مولوی صاحب کے گھر میں قدم رکھا تو قدم رکھتے ہی اُن کی پہلی نظر تو بٹیا بی پر ہی پڑی تھی جو ایک جھجک، ماں کا حکم سنتے ہی اندر بھاگ گئی تھی۔

وہ تب ہی جان گئی تھیں کہ لوگ شریف ہیں، ورنہ تو حیدر آباد میں مشاطہ بی کو حویلیوں میں ڈیوڑھیوں میں گھروں میں، داخل ہوتے دیکھا ہیں کہ بیگمات نے جان جان کر بیٹیوں کو کام تبانا شروع کیا نئیں ـــــ حالانکہ گھروں میں، حویلیوں میں نوکرانیوں خواصوں کی فوج پڑی ہے، لیکن مشاطہ بی کو چائے، شربت، پان تمبا کو نواب زادیاں ہی لالا کر پیش کریں گی ـــــ

پھر مشاطہ بی کو زور کا زناٹا اُس وقت بیٹھا جب اُنہوں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا ـــــ

"اپنی بی بی ماں کو مٹھا برس لگا اچ ہوئیں گا اب تو ـــــ نئیں ماں ـــــ؟"

"کس کو ـــــ میری شکو ماں کو ـــــ نئیں ماں ـــــ اب یہ سال میں اٹھارہ بھر کو اُنیسواں سال لگیں گا ـــــ"

پچیس پچیس برس کی عورتیں نما لڑکیوں کو پندرہ پندرہ برس کی بتانے والی مائیں بھی مشاطہ بی کی نظروں سے گزری تھیں ـــــ اُنہوں نے لڑکی کا پچھانواں دیکھا تھا ہاتھ پاؤں سے گوری نظر آئی تھی ـــــ شرافت تھی، اسکول میں پڑھ رہی تھی، گوری تھی صورت بھی اچھی ہی ہوگی ـــــ انہوں نے اطمینان سے برقعے کے اندر سے اپنی تلے دانی نکالی ـــــ کالا دھاگا بندھا چشمہ نکال کر آنکھوں پر چڑھایا ـــــ کچھ سرٹیفکیٹ رجسٹر کی اور "شجرہ" نکال کر بیگم صاحبہ کے سامنے رکھ دیا ـــــ

"آپ بولے تو میں بچے کی تصویر بھی لاکو دیوں گی ـــــ بھوت بھی بھوت اچھا بچہ ہے۔ نواب لوگاں ہیں، پن شریف بھی ہیں ـــــ ہو میں اس واسطے یہ بات بولی کی کوئی کوئی نواباں رانڈاں رنڈیاں رکھ کو اپنی عاجبت بگاڑ ڈالے ـــــ خاندان تباہ کرلیے ـــــ پن انوں ایسے نئیں ـــــ آپ لوگاں بھی شریف، اُنوں بھی شریف ہو وہ، میں گھروں گھر، حویلی حویلی رشتہ ڈھونڈنے پھری سو اُس کا محنت کا پیسہ دیں

گے پن میں کھوٹ کا پیسہ نہیں لیتی ـــــ دے دیو بیٹی ایسے لوگاں پھر نہیں ملیں گے ــــ"

اور یہی باتیں انہوں نے دولہے والوں سے بھی کہیں اور رشتہ بھی طے ہوا اور بات بھی پکی ہو گئی اور شادی بھی ہو گئی ـــــ شکو ماں لال حویلی کی بھاگ بھری بہو بن کر سسرال آ گئیں ـــــ

لال حویلی میں جو بھی بہو قدم رنجہ فرماتی، اُسے خطاب ضرور دیا جاتا ـــــ افشاں دُلہن ـــــ حسین دُلہن ـــــ گوری دُلہن ـــــ ہیرا دُلہن ـــــ موتی دُلہن ـــــ

شکو ماں کے گھرانے اور خود اُن کی ایسی تعریفیں مشاطہ بی نے کی تھیں، اور بعد میں ریتوں رسموں میں جانے آنے میں بھی اندازہ ہو ہی گیا کہ واقعی بے حد ہی نیک اور شریف گھرانہ ہے اور بڑی شریف اور بے مثال بہو ملی ہے تو بڑی پاشا نے زیادہ ہی خوش ہو کر "شرافت دُلہن" ـــــ کا خطاب، نئی دُلہن کو دیا ـــــ

ڈھائی تولے کی وزنی نتھ، جس کے بیچوں بیچ سفید ساتچے پانچ موتی اور آزو بازو سُرخ لاڈلیاں پڑی ہوئی تھیں، انہوں نے بہو کی ناک میں کھچ سے ڈال دی۔ دُلہن کے موتھ سے بے حد ضبط کی کوشش کے باوجود "سی" نکل گئی۔

"ابھی آگے تو اس سے بھی بُرے بُرے وخت آئیں گے ــــ"، کوئی سُسرال والی گھونگھٹ میں موتھ ڈال کر بے شرمی سے، لیکن سرگوشی میں بولی ـــــ

لیکن اچھا نہ بُرا، کوئی وقت آ ہی نہیں چُک رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی کمر درد کرنے لگی ـــــ جسم کا جوڑ جوڑ فریاد کر رہا تھا ـــــ شاید خُدا نے اس کی سُن لی تھی ـــــ

کمرے میں کچھ چلنے پھرنے کی سی آوازیں آئیں ـــــ شاید دُولہا میاں، سہرا اُتار کر لشکار رہے تھے۔ کپڑے، جامے جار کی شیروانی، دستار نما کلاہ، سلیم شاہی جُوتے۔ سب بڑھا رہے تھے ـــــ ایک نئے تجربے سے رُوشناس ہونے کی گھڑی آ گئی تھی۔

دھک ـــــ دھک ـــــ دھک ـــــ

وہ خود تو کیا، ایسا لگ رہا تھا کہ پورا حیدرآباد اس کے دِل کی دھڑکن میں رہا ہے ــــ

وہ آکے اس کے چھپر کھٹ کے پاس رُکے ــــ بیٹھے نہیں ــــ گھونگھٹ اُٹھا کر آہستگی سے پیٹھ پر ڈال دیا ــــ آنکھیں کھولنے کی درخواست بھی نہیں کی ــــ بڑی ہمت سے رُک رُک کر، اٹک اٹک کر بولنے لگے ــــ

"شرافت محل ــــ آپ کے ناک میں امنی حضور یہ نتھ پہنائے سو آپ کو اس کا مطلب معلوم ہے ــــ؟؟"

وہ اپنے آپ میں بے چین سی ہوئی ــــ بولی کچھ نہیں ــــ کان ہی سُنتی رہی۔

"نتھ خالی زیور نئیں ہوتا ــــ ہمارے لال حویلی میں جب ایک دُولن کو نتھ پہنائی جاتی تو اس کے ساتھ ساتھ سُہاگ کا سارا مان، ساری عزّت گویا دُولن کو سونپ دیتے ــــ آپ ایسا بھی سوچ سکتے کی یہ نتھ ایک طرحوں سے عزّت ہور غرور کی رکھوالی کرتی۔۔۔۔"

دُلہن کا سر جکرا سا گیا ــــ میکے سے وداع ہوتے وقت امنی نے کہا تھا ــــ

"بی بی سُسرال والے نتھ چڑھائے سو اس نتھ کی شرم رکھنا ــــ دُکھ میں سُکھ میں، اب ہمیشہ سُسرال کو اِچ میکہ سمجھنا، ہور ڈولی میں بیٹھ کو جارئیں وہاں سے ڈولے میں سو کو نکلنا ــــ اپنے دُولہے میاں کی عزّت سنبھالنا ــــ اِنے ڈھائی تولے کی چھوٹی سی نتھ دِکھتی پن تمے اس کو نئیں حقیر سمجھنا ــــ اس کی شرم رکھنا بیٹی ــــ اس کی شرم رکھے سو سمجھنا کی اپنے ماں کی شرم ہور عزّت رکھے ــــ"

"نتھ نہ ہوتی اُجاڑ جی کا جنجال ہو گئی ــــ میکے والے اس کو بول رئے یہی اِچ عزّت ہور شرم ہوتی ہور دُولے والے ہور دُولے میاں خود بول لے رئیں کی یہ غرور ہوتی ــــ"

"ہم کو معلوم ہے کی ہم آپ کو یہ تبا کو کوئی بڑی خوشی نئیں دے رئے، مگر آپ اتّے شریف ہیں ہور اب تو ہماری دُولن بھی ہیں، ہماری عزّت بھی ہمارا غرور بھی، تو ہم آپ کو بھوت سچائی سے تبارئے کی ہم آپ کے لائخ نئیں ....."

اسکول کی طرف سے ایک بار وہ گولکنڈہ کا قلعہ دیکھنے گئی تھی ——— شہر سے دور جاکر حیدرآبادی چٹانوں اور گول پتھروں کا سلسلہ شروع ہوا تھا ——— بڑے بڑے گول گول، چٹان نما پتھر، ایک کے اوپر ایک اس قدر اُدھر رکھے ہوئے کہ لگتا تھا کہ ایک دھکا لگا، یا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ دھڑ سے زمین پر ———

"اللہ ———" وہ آپس میں ہنس بول رہی تھیں ——— "کبھی اتّی بڑی چٹان کسی کے سر پر آکو پڑ گئی تو وہ تو مراچ جائیں گا ہو ———"

اب اسے ایسا لگا کہ ایسی ہی ایک بڑی چٹان نے اچانک گر کر اُسے کچل دیا ہے کیوں کہ وہ کچھ ہی جا رہے تھے ———

"آپ کے گیا ——— ہم عورت ذات کے خابل اچ نئیں رہے ——— ہم اپنی جوانی ہور زندگی غلط کاماں کر کے تباہ برباد کرڈالے ......"

"اپنی زندگی تباہ کرے بہوت اچھا کرے مگر میں کیا خصور کری تھی کی یہ سزا میرے کو دئے ———" اُس نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا لیکن لب خاموش ہی رہے۔

"اب آپ ہمارے ہیں تو ہم آپ سے تبارئے کی اتی بڑی دُنیا میں یہ بات خود سوائے ہمارے کسی کو نئیں معلوم۔ ہور کسی کو معلوم ہو بھی کیسے سکتی ——— ؟ کتے اشتہاراں پڑھتے رہتے ہم ——— پر سب بے کار کے باتاں ہیں ——— کسی سے فائدہ نئیں ہوتا بول کے ..."

اچانک اُس نے تیزی سے آنکھیں کھول کر چہرہ اوپر اٹھایا ———

کاجل ——— مسّی ——— افشاں، جھمکے، جھومر، سُرخی، غازہ ——— سب ایک

طرف، اور تپے ہوئے گورے گورے جوان چہرے کی، سوکھے ہونٹوں کی پیاس ایک طرف —— آنکھیں جو زبان نہیں تھیں، لیکن زبان کی طرح بول رہی تھیں ——

گورے، تپے ہوئے اور سرخ چہرے کے نیچے گوری گردن تھی —— گردن سے نیچے کرتے کی بٹن پٹی تھی جس میں سونے کے گھنگھرو لگے بٹن جھمک رہے تھے، اور جب اس نے تیزی سے چہرہ اوپر اٹھایا تھا تو بٹن چھنک اٹھے تھے اور کرتے کے اندر ایک طوفان سا مچل اٹھا تھا ——

"آپ ہم کو ایسی نظراں سے مت دیکھو —— ہم واقعی آپ سے شرمندہ ہیں..."

وہ تو انہیں یوں دیکھ رہی تھی کہ واقعی اس کے چہرے میں کیا ہے ——؟ جسم کی خبر تو خود انہیں رہی ہو گی، لیکن چہرہ مردوں سے بدتر تھا —— اُسے یاد آیا مشاطہ جب اُن کی تصویر پہنچا گئی تھی تو چہرے پر مونچھیں ہونے کی وجہ سے سب سہیلیاں اُسے گندے گندے مذاق کر کے چھیڑ رہی تھیں، لیکن ایک دو نے جب جبر کر کے اس کو زبردستی تصویر دیکھنے پر مجبور کر ہی دیا تھا تو اسے تب ہی لگا تھا کہ یہ چہرہ بیمار بیمار سا کیوں لگتا ہے —— آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے کیوں ہیں...

وہ اس کے چہرے کی زبان سمجھ کر اپنے آپ سے بولنے لگے: "ہمارا نام وجاہت نواب ہے —— ہم واقعی وجاہت —— مردانہ وجاہت کی زندہ تصویر تھے —— آپ کو سننے میں برا ضرور لگیں گا کیوں کہ کوئی عورت، دوسری عورت کا ذکر نہیں سننا چاہتی۔ مگر ہم آپ سے بتا رئے کی ہم کوئی پارسا نئیں تھے —— ایک ایک عورت ہمارے خواب گاہ کی زینت بنی —— مگر ہمارا یہ حال کری ایک کمینی طرار رنڈی — اسی لال حویلی کی ایک پوتی ——

وہ نفرت سے سنتی رہی ——

"وہ بہوت ہی بہوت حرام زادی تھی —— آپ سیدھے سادے گھرانے کے،

ایک مُدرّس صاحب کی بیٹی —— آپ کو ڈیوڑھیاں ہور محلاں کے اندر کے باتاں کیا معلوم —— یہاں ایک اِچ چھوکری اگر والد صاحب کو پسند آ گئی تو کچھ فرخ نئیں پڑتا کی بیٹے صاب بھی اس کو اِچ پسند کر لئے تو —— رشتے کے میرے پھپیرے بھایاں بھایاں ایک اِچ پوٹی سے رنگ رلیاں مناتے —— یہ بات سوب کو آپس میں معلوم رہتی ہور وہ پوٹی کو بھی معلوم رہتا —— محل کے مرد لوگاں کیا بولتے معلوم —— کی "ایک نل سے کتے بھی لوگاں پیاس بجھا سکتے —— سو ایک چھوکری بہوت حرامی تھی —— ہمارے سوب بھایاں دوستاں اُس سے گندے مذاخاں کرتے ہور وہ بھی ایسے اِچ جواباں دیتی —— وہ بہوت تن درُست بھی تھی —— وہ جدھر سے بھی جاتی چھوکرے پوچھتے ——

"کُرتے کے اندر کیا ہے تیرے ——؟"

کسی کو بولتی —— "کُرتا اُٹھا کو بتا دیوں کیا، کیا ہے بول کے ——"

کسی کو جواب دیتی —— "تیرے سے میرے کو بچہ ہوئیں گا نا ——؟ اُس کا دودھ ہے کُرتے کے اندر ——"

ایک دن ہم بھی شرارت کی ترنگ میں تھے۔ ہم بولے: "اتّا سارا دودھ بچے کو اِچ پلادیں گی کیا ——" تو اُس حرّافہ نے کیا کری ہم کو پکڑ کے اپن مانڈی پہ لٹالی ہور بولی "بچہ اِچ خالی کائے کو —— بچے کا باپ بھی پئیں گا —— ہور ایسا بول کو سچ میں ہمارے موںہہ میں دودھ گھُسیڑ دی —— ہور وو اِچ لمحہ ہم بے بس ہو کو رہ گئے۔!

اُس کے بعد ہم نا نئیں معلوم اُنے کیا زہر ہماری جوانی میں گھولی کی ہم کسی کام کے نئیں رہ گئے —— ہماری بہادری، ہماری مردانگی کہاں چلی گئی، ہم خود حیران ہیں، ہم عورت کے خابل اِچ نئیں رہے —— بس اپنی مدد آپ کر لیتے ہور اب وہ بھی کیا ......"

دُلہن ہانپ رہی تھی —— کانپ رہی تھی —— "آپ یہ سوب باتاں میرے کو

کاہے کو ستاوے رئیں ——— میں بھی آخر عورت ہوں ——— میرا تو کچھ خیال کریئے آپ . . .

وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ———

وہ اسی لہجے میں کہے گئے ———

"آپ آج ایک اِچ بار زندگی بھر کا رونا رو لیو، کیوں کی پھر تو آپ سوب لوگاں کے سامنے رو بھی نئیں سکیں گے ———

انہوں نے ٹیبل پر سے چابیوں کا ایک وزنی گچھا اُٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیا۔

"یہ ہماری ذاتی تجوری کے چابیاں ہیں - آپ نا اس محل میں سب کچھ ملیں گا ——— کوئی چیز کی کمی نئیں رہیں گی کمی جس چیز کی رہیں گی وہ ہم خود بتائے دیتے ہور اس لئے بتا دِیے کی ہم نا معلوم ہے کی دُنیا میں کوئی بھی مَرد، اگر حالات کا شکار ہو کو نامرد بن بھی جاتا تو اپنے آپ سے بھی وہ یہ بات چھپاتا - مگر ہم آپ کو اپنا ہمدرد جان کو اس لئے بتا دئے کہ امی حضور ہور بابا حضور ہماری جان شادی کے واسطے کھالئے کیوں کی اُنوں کو جائداد کا وارث ہونا کتے ——— دوسرے چچا تایا کے اولاداں پو اولاداں ہوتے جارئے اس واسطے ——— ہم اگرچہ بولتے کی ہم نا شادی کرنا ہئ اِچ نئیں تو کوئی نا سنتا ——— کیوں کی شادی نئیں کرنے کے واسطے بھی کوئی نہ کوئی تو معقول وجہ ہونا پڑتا ——— اب اپنے موتھ سے مر بھی جاتے تو یہ کیسا بول دیتے کہ ہم عورت کے خابل نئیں رہے ——— ؟ ہور اب جو اولاد ہوئیں گی اِچ نئیں تو یہ خدرت کی بات سمجھی جائیں گی ——— کیوں کی عورتاں میں بھی تو کوئی کوئی بانجھ رہتے نا . . . ؟ دُلہن نے تڑپ کر چیخ ماری ——— "خدائے واسطے ایسا نکو بولو آپ . . . . . . " وہ چھپر کھٹ کی پٹی پر سر پٹخ پٹخ کر رونے لگی . . . . . . وہ بے چارگی سے کہے گئے ———

"اسی واسطے ہم مشاطرنی کو خاص طور سے جتائے تھے کی ہم کو خود اللہ پاک بے حد دولت دیا، ہم کو خالی انگ کے جوڑے سے دولن لا دیو مگر شریف ہونا ———

کیوں کی شرافت ایسی دولت ہے کی اس کا کوئی مول اچ نئیں —— آپ کو معلوم نا یہ حیدر آباد کے مشاطہ رانڈاں کیسے کیسے اپنے دِلاں سے باتیں بناتے جھوٹ کا سچ ہور سچ کا جھوٹ بناکو، گھر گھر گھوم کو رشتے تلاش کرتے، مگر ہم اُنوں کو بول دیئے تھے کی ہم کو خالی شرافت ہونا —— پھر جب مشاطہ بی آپ کے گھر ہور خاص طور سے آپ کے اُمّی —— کی تعریفاں کرے تو ہم اِک دم سمجھ گئے کی شریف ماں کا خون ہے تو بیٹی بھی بے حد شریف ہوئیں گی —— ہمارے اُمّی حضور تو نواب خاندان میں اچ رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر محل بھرے میں ہمارا اِچ حکم چلتا —— سب لوگاں ہم سے خوف کھاتے . . . "

دُلہن نے انہیں غور سے دیکھا —— وہ اپنی کہے گئے —— اپنے حیدر آباد میں مشہور ہے کی یہاں کی کُتی میں وفا ہور یا مت ہو پر بیوی میں کُتّے کے جیسی وفاداری ہوتی —— "

انہوں نے آگے بڑھ کر کھونٹی میں ٹنگا زرتار کلاہ دستار سمیت اُتارا اور اس کے قدموں میں لاکر ڈھیر کر دیا —— " ہم آپ سے التجا کرتے، ہمارا غرور کبھی مت توڑنا . . . "

اس نے گھبرا کر پیر سمیٹ لئے ——

"کتنا مجبور ہوئیں گا یہ آدمی جو عورت کے پیر پو اپنا سر رکھ رہا ہے —— اللہ نے قسمت اچ ایسی بنایا تو چلو میں بھی یہ سوچ کر چھاتی پو پتھر رکھ لیوں گی کی جیسے میری شادی اِچ نئیں ہوئی —— جیسی اماں باوا کے یہاں رہتی تھی ویسی یہاں —— کنواری اچ سمجھتی رہوں گی خود کو . . . . "

لیکن سوچ لینا اور بات ہے اور سہن کر لینا قطعی اور —— جب نئی نئی شادی ہوتی ہے تو مہندی، اگر، عود، عطر، پھول اور مسالوں سے ہٹ کر خود لڑکی اپنے آپ میں خوشبو دینے لگتی ہے۔ اور اپنے ہی تن بدن سے پھوٹتی ہوئی جوانی کی یہ مہک، ہرن

کی طرح خود کو پاگل بنا دیتی ہے ــــ ایسے میں بدن کی رگیں ایسا کساؤ مانگتی ہیں کہ چٹختے بدن کو جو کچکچا کر رکھ دے ــــ اور یہی سب کچھ نئی نویلی دُلہن پر گزر رہی تھی۔

پھر لال حویلی کی درجن بھر بیاہی اَن بیاہی چچیری، تایا زری، ممیری، پھپھیری بہنیں بھاوجیں ــــ دیورانیوں، جٹھانیوں میں تو ویسے ہی جتنی دُشمنی، اتنی ہی دوستی ــــ اپنے اپنے میاؤں کی باتوں کے دفتر کھول کر جب سب بیٹھیں تو شرافت دلہن کی خود ساختہ شرافت کی دھجیاں بکھیرنے کو آجاتیں ــــ

آئے دن کسی بچے کی بسم اللہ ہو رہی ہے۔ کسی کی ختنہ کی تقریب ہے، کسی کی سالگرہ کا دھوم دھڑکا ہے تو کسی کا چھلّہ ــــ کوئی بھی تقریب ہو، محل والیوں کو تو سنگھار پٹار کا موقع اللہ دے ــــ ایک سرے سے سب ہی دُلہن بن جاتیں اور ساس کو پہننے اوڑھنے کے بعد سلام کرنے جانا تو محل کا دستور ہی تھا ــــ

"اللہ سدا سُہاگن رکھو ــــ گود بھر کو بچے دیو ــــ" یہ دُعا سنتے ہی شرافت دُلہن کا کلیجہ ہل جاتا ــــ یہ لمبا سا دستر خوان بچھا تو امّی حضور، کھٹی میٹھی چٹنیاں اور اچار دُلہن کے سامنے سرکواتیں ــــ

"اَئی اس کے سامنے رکھو جی ــــ شرم کے مارے موہنہ سے کیسا تو بھی منگیں گی اُنے ــــ"

وہ دستر خوان پر جاتے لرزنے لگی تھی۔

نمازوں کی عورتوں کی صف، لال حویلی کی مسجد میں سب سے پیچھے لگتی تھی ــــ اتنی بڑی حویلی تھی، دل بھی بڑا تھا، پیسہ بھی خُدا نے خوب دیا تھا، نام بھی تو سخاوت یار جنگ تھا وجاہت نواب کے باپ کا ــــ مسجد حویلی کے اندر ہی بنوا رکھی تھی، جہاں پانچ وقت موذن اذان دیتا اور پابندی سے نمازیں ہوتیں۔ نمازوں سے شرافت دُلہن غائب ہوتیں تو ساس کے جی کو پتنگے لگ جاتے۔

"اَئی دولن کی اس مہینے کی نماز بھی قضا ہو گئی ـــــ؟"

شاد نگر میں بھی سخاوت یار جنگ کی بے حساب زمینات تھیں ـــــ وجاہت نواب اکثر موضع پر ہی رہتے ـــــ اُمّی حضور بڑبڑ کر بیٹے کو سناتیں ـــــ

"اب دُولن کے پاکی کے دِن آ رئیں ـــــ اب تے پھر موضع کو گئے تو دیکھو ذرا ـــــ اگے مہینے کے بعد تو البت کر کے اللہ کھیتی ہری کرتا ـــــ"

لیکن مہینوں پہ مہینے نکلتے گئے اور شرافت دُلہن کی گود سُونی کی سُونی ہی رہی۔

جب بھی موضع پر سے وجاہت نواب آتے، پوری لال حویلی میں ہنگامہ مچ جاتا۔ نوکر لرز رہے ہیں ـــــ نوکرانیاں ڈر کے مارے کونوں میں چھپ رہی ہیں ـــــ چچیاں تائیاں، بھائی، بہنیں مونہہ چھپاتے پھر رہے ہیں ـــــ

"یہ حویلی کی کب سے صفائی نئیں ہوئی ـــــ" وہ خواہ مخواہ جالے تلاش کرتے ـــــ

"موتیا کے پھولاں اِتے کم کیوں کھِلے ـــــ مالی کِدھر مر گئے ـــــ" "گھوڑوں کی مالش کرتے کیا نئیں کم بختے سائیس لوگاں ـــــ کتے مریل ہو گئے ـــــ"

"ماہ وباری کا خالین کِتا میلا ہو گیا ـــــ ابا حضور کے کتے مِلنے جُلنے والے آتے ـــــ کیا سوچیں گے لوگاں ـــــ؟"

"خواجہ سرا حرام کے روٹیاں توڑتا گیا ـــــ فانوساں پو کِتی گرد جم گئی ـــــ"

چلّا چلّا کے وہ اپنا گلا بٹھا لیتے ـــــ سب اُن سے تھر تھر کانپتے ـــــ

صرف شرافت دُلہن سمجھتی تھیں یہ سب پردہ ہے ـــــ ڈھکوسلہ ہے ـــ اپنے ہاتھوں جتائی گنتائی تھی، لیکن اِس وقت تو وہ مجبور تھے ـــــ وہ بھی مجبور تھیں ـــــ لیکن انہیں اس مجبوری میں پوری لال حویلی کے مکینوں کا بے پناہ پیار میسر آیا تھا ـــــ نوکر اُن پر جان چھڑکتے ـــــ مالک تو خیر تھے ہی فدا ـــــ اُن کی ذرا سی تکلیف پر ماما بی سے لے کر

خواصوں تک، خواصوں سے لے کر انّا بی تک، انّا بی سے لے کر مغلانی امّاں تک اور مغلانی امّاں سے لے کر خواجہ سرا تک سب تڑپ اُٹھے ——

اُس دن بھی وہ وجاہت نواب کے موضع پر چلے جانے کے بعد سر کے درد سے بے حال پڑی تھیں تو خواجہ سرا فانوس جلانے اُن کے کمرے میں آیا ——

"دولن پاشا میں سر دبا دیوں ——؟"

یہ لمبی چوڑی محمود بی اُن کے سرہانے کھڑی پیار سے پوچھ رہی تھی۔

اُنھوں نے تکلیف میں بھی مُسکرا کر کہا ——

"شبراتن، چنبیلی، صنوبر، کیاری، مہندی، گلشن ایک چھوڑ دس سر دبانے والیاں ہیں —— تو جا اپنے چراغوں میں تیل ڈال۔

"وہ تو میں روز اچ کرتی —— پن آپ ایسا پڑ گئے تو اچھا نئیں دِکھ را —— دبا دی ذرا سا تو میرا کیا کام بڑھ جائیں گا —— آپ کو تو آرام آجائیں گا ——"

انھوں نے اپنے ڈھیر سارے بالوں کا جُوڑا کھول دیا۔ بال سیاہ آبشار کی طرح چھپر کھٹ سے فرش تک پھیل گئے ——

"اَئی ماں دُولن پاشا —— بالاں گیلے ہَیں بول کے بھی سر دُکھ را ہوئیں گا ——" خواجہ سرا نے دونوں ہاتھوں سے اُن کے بالوں کا گیلا پن محسوس کر کے کہا —— "میں ٹوکری میں عود دان ہور اگر بتیاں ڈال کو لاتی ہور دھواں دیتی ابھی سُوکھ جاتے بول کے ——"

"رہنے دیو محمود بی اپنے دل کا خود کا دھواں بہوت کافی ہے ——"

خواجہ سرا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اُن کی پیشانی پر رکھ کر ذرا بوجھ دے کر دبائی ہی تھی کہ وہ ایک دم ہڑبڑا گئیں —— کیسا مضبوط ہاتھ تھا یہ!!

"محمود بی ——" انھوں نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا: "تمے

جہ سرا ہوتے ــــ؟"

خواجہ سرا سہم کر اُٹھ کھڑا ہوا ـــــ

"دولہن پاشا ـــــ آپ پڑھے لکھے سو بی بی ہیں اس لیے بولتاؤں کِسی آج تک یہ بات نئیں بولا نئیں تو مارا جاؤں گا ـــــ مَیں اچھا خاصا مرد ہوں پاشا، پن اس پیٹ کی خاطر یہ ڈھونگ رچا کو بیٹھا ـــــ لال حویلی میں تنخواہ، کھانا سو سب بہوت بھی بہوت ملتا پاشا ـــــ ہوا پر سے انعامات، عید بکر عید پولین دین ـــــ

"ہور یہ عورت ذات کا بھیس بدل کو رہتے وے تم نا ذرا سی شرم بھی نئیں آتی ــــ؟"

اس نے ندامت سے سر جھکا لیا ـــــ

"شادی ہو گئی تمہاری ـــــ؟"

"ابھی کاں سے پاشا ـــــ" وہ ذرا شرما کر بولا: "ابھی گھر میں میرے سے چھوٹے ہیں پن دو جوان بہناں ہیں ـــــ امّی کو بول کے رکھا ہوں پہلے اُنوں کے شادیاں کروں گا، پھر اپنی ـــــ اُمّی کو مالوم نئیں پاشا کی مَیں یہاں حویلی میں ایسے زنانی کاماں کرتاؤں بول کے ـــــ گھر کو جاتے وخت مَیں چوڑی دار پیجامہ، ململ کا کرتا ہور سلیم شاہی جوتے پہن لیتا پاشا ـــــ"

انہوں نے اس کے لمبے چوڑے قد بُت کو دیکھا اور ایک بے حد ہی واہیات سا خیال اُن کے ذہن میں رینگ گیا ـــــ "پیجامے، ململ کے کُرتے اور جوتوں کے بغیر تو تُو نے ہور بھی اچھا لگتا ہوئیں گا ـــــ"

"لال حویلی ہے تم نا شرافت دُلہن کا خطاب مِلا ہے ـــــ" اُن کے دِل نے انہیں سمجھایا ـــــ

وہ توبہ استغفار کر کے کروٹ ہو گئیں ـــــ

"تو جا ـــــ میرے کو اب نیند آ رئی ـــــ"

یہ سب کچھ کبھی نہ ہوگا، ہرگز نہ ہوگا، لیکن اب جب کہ اُن کی شادی کو دو سال گذر چکے تھے، اور اُن کے بعد ہونے والی دو شادیوں نے پھل دینے شروع کر دئے تھے ـــــ ماں بے چاری بہر حال ماں تھیں ـــــ بیٹے کی اولاد دیکھنے کے ارمان میں ختم ہوئی جا رہی تھیں۔ اس لئے اپنی جیٹھانی، دیورانی اور ان کے بال بچوں میں بیٹھ کر غم سے بولیں ـــــ

"اَئی دیکھو نا ماں ـــــ وجاہت پاشا کے بعد تمہارے شوکت پاشا اور رضا پاشا کے شادیاں ہوئے ـــــ دونوں باپ بن گئے ـــــ بس میرے وجاہت پاشا کے نصیب میں اِچ اولاد کا سکھ نئیں ـــــ"

کوئی بولیں ـــــ "آئی آپا ماں کوئی کوئی عورت اِچ بانجھ ہوتی ـــــ اب انسان کے ہاتھ کی تو یہ بات ہے نئیں ـــــ"

"تو دوسری بہو بیاہ کو لے آؤں ـــــ؟ اولاد کے واسطے تو لوگاں چار چار چھ چھ بھی کر دالتے ـــــ امتی حضور بے حد کھُلے دل سے بولیں ـــــ "اب ایسا تھوڑی ہے کی اللہ نہ کرے دولت کی کوئی کمی ہے ـــــ میرا بیٹا پچاس بھی بیویاں کرا تو پیسے کی کمتی نئیں پڑنے والی ـــــ"

"تو کر دیو بسم اللہ ـــــ" جٹھانی بولیں ـــــ

"بس آخری بار یہ مہینہ ہور دیکھ لیتیوں ـــــ پھر نئیں تو عصمت یار جنگ کی پوتی کو کر کے لا لیتیوں ـــــ پہلے بھی میرا دل وہیں اِچ تھا ـــــ"

"اَئی تو وہ اب سوکن پو کائے کو دیں گے ـــــ"

"اَئی بول دیں گے اصلی بیگم پاشا اُنوں رہیں گے۔ یہ اپنے پہلی والی نِکّے

...رخت کاٹ لیں گی....

سر سر سر آگ کے شعلے اُس کے تن بدن سے اُٹھنے لگے، وہ دوسرے ہی
ے میں چھت کی کڑیاں گنتی ہوئی پڑی تھی ـــــ اتنی بڑی حویلی، اتنے نوکر چاکر،
ل نہ بچہ، میاں دیکھو سوتے موضع پر ـــــ سوائے چھپر کھٹ پر لیٹے رہنے اور
ڑھتے رہنے کے کام ہی کیا تھا ـــــ؟؟ ساری باتیں اس نے اپنے کانوں سے
یں ـــــ

"شرافت دُلہن ـــــ" انہوں نے اپنے آپ کو سنایا ـــــ "تم کتنے بھی گنہ گار
ہی ـــــ خدا اُس سے بھی بڑا رحم کرنے والا ہے ـــــ تم گناہ کرتے کرتے تھک
ی گئے تو بھی اللہ رحم کرتے کرتے کبھی نہیں تھکتا ـــــ"

عشا کی نماز کے بعد اُنہوں نے کیاری کو بلوا بھیجا ـــــ "خواجہ سرا اپنے گھر
س گیا ہو نہیں گا تو اس کو جا کے بول میں بلا رئی ـــــ"

محمود حیران سا، اس ناوقت کی طلبی پر اندر چلا آیا ـــــ وہ اپنے لمبے چوڑے
پر کھٹ پر پڑے پڑے بولیں ـــــ "محمود آج فانوس میں تیل ڈال دے ـــــ"

محمود بی نے چھت پر لگے جگر مگر کرتے فانوسوں کو دیکھا جو جی بھر کے روشنیاں
رہے تھے ـــــ "تیل تو ہے پھر ـــــ؟" حیرت سے پھر اُس نے مہکتی ہوئی
ن پاشا کی طرف دیکھا ـــــ

آخر میں اس نے دروازے کی طرف دیکھا جو کھلا پڑا تھا ـــــ اس نے دُولن
شا" پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر، پیچھے قدم قدم چل کر، بغیر مُڑے دروازے کے
ے کو ایک جھٹکے سے بند کیا اور چیتے کی سی تیزی سے اچھل کر "دُولن پاشا" کے
ھٹ میں کود گیا ـــــ

صبح گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سے شرافت دلہن کو پتہ چل گیا کہ نواب زمینات پر سے لوٹ آئے ہیں۔ بستر آج سے زیادہ پیارا انہیں کبھی نہ لگا کہ رضائی، گدّا، تکیے، چادر ـــــ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ کبھی وہ رضائی سے لپٹتیں ـــــ کبھی گدے کو خود پر لپیٹنے کی کوشش کرتیں ـــــ کبھی تکیوں پر اوندھ جاتیں کبھی تکیوں کو خود پر رکھ کر دباتیں ـــــ اور چادر نے تو زندگی میں جیسے بہاروں کے پھول بکھیر دئے تھے ـــــ ویسے وہ ہمیشہ وجاہت نواب کے آنے کی ہلچل سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ جاتی تھیں لیکن آج اُن کا دل بستر چھوڑتے نہیں ہو رہا تھا ـــــ پھر بھی انہیں وجاہت نواب کے آنے سے بڑی خوشی ملی ـــــ

"بڑے اچھے موقعے سے آئے ـــــ"

نوکرانیوں کی فوج ہونے کے باوجود اُنہوں نے طے کیا کہ "اپنی چادر آج میں خود اِج دھوؤں گی ـــــ"

اس بار وجاہت نواب جو موضع پر گئے تھے تو پورے دس ماہ بعد آئے خط پتر تو وہ لکھتے ہی نہیں تھے۔ ہاں خادموں کی زبانی حویلی کے حالات کسی کی بیماری، کسی کی موت، کسی کی شادی، کوئی تقریب، سب حال احوال معلوم ہو جاتا تھا ـــــ

اب کی بار خاص خادم حیدر آباد سے موضع واپس پلٹا تو شرما شرما کر مگر ادب سے بولا ـــــ

"نباب پاشا ـــــ سوا سو روپے کی سونے کی زنجیر لیوں گا آپ سے"

وہ اپنے گھوڑے کی مالش کا معائنہ کر رہے تھے، بے خیالی میں بولے :

"لے لینا ـــــ" پھر اچانک چونکے ـــــ "مگر کائے کو رے بٹے ـــــ"

"اگے سرکار ــــ چھوٹے سرکار پیدا ہوئے ہوں گے ــــ"

انہوں نے چکرا کر خادم کو دیکھا، پھر تیزی سے سائیں کے ہاتھوں سے گھوڑا
چھینا اور پھر چوڑ کے ہیں تو آکے لال حویلی میں ــــ

یہاں تو وہ دھوم دھام تھی کہ اُن کی شادی پر بھی کیا ہوئی ہو گی ــــ ماں
کی دُعائیں سمیٹتے، چچیوں، تائیوں، بہنوں کی بلائیں جھیلتے وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو
شرافت دُولہن بے حد ممتا بھرے فخر سے اپنے بیٹے کو دُودھ پلا رہی تھیں ــــ

"ذرا دروازہ بند کر لیونا آپ ــــ" انہوں نے بے حد اپنائیت سے کہا
بچے کو دودھ پلا ریوں، کسی کی بھی نظر پڑی تو نظر لگ جائیں گے ــــ"

وہ سامنے آکر غصہ سے کھڑے ہو گئے ــــ "یہ سوب کیا ہے ؟"

"یہ ــــ ؟" وہ اپنی گود میں پڑے بچے کی طرف اشارہ کر کے بولیں ــــ
نے آپ کا بچہ ہے ــــ"

وہ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھے ــــ لیکن اُس نے ہاتھ کے اشارے
انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا ــــ

"ذرا صبر سے کام لیو آپ ــــ میں حوب سمجھا تیوں آپ کو ــــ میرا نام
تو ــــ شاکرہ تھا، صابرہ بھی ہو سکتا تھا، زاہدہ بھی، شُکر کر لیتی، صبر کر لیتی، زہد
، آپ کے واسطے سوب کر لیتی کیوں کہ آپ بولے تھے نا کی نتھ ایک طرح ول
زت ہور غرور کی رکھوالی کرتی ــــ ہور یہ بھی بولے تھے کہ اس عزت کو
ل کر رکھنا اب میرا اِچ کام ہے کیوں کی میں "شرافت محل" کا خطاب آپ
ی سے پائی ــــ

پھر اُدھر امّاں باوا بھی بولے تھے کی نتھ کی شرم رکھنا، سو یہ نتھ غرور ہور
بوجھ سے اتی بھی اتی وزنی ہو گئی کی میں اِچ لچک کو رہ گئی ــــ پھر بھی میں

صبح گھوڑوں کے بِن رہی ——

نواب زینبات پر جب گیا ہوا آپ کو نہیں معلوم —— امّی حضور بولے کی میں بانجھ ہو

—— رضائی، گیہو کبھی کر کو لاتے —— اب آپ اِچ سوچو آپ اپنا اتا بڑا اعزاز میرے

کبھی وہ ایسا نئے کرے، خالی یہ سوچ کو کی میں شریف ہوں، اب آپ یہ بھی سوچو کی اگ

تکیہ دوسری آنے والی آجاتی تو وہ آپ کے جیسی نواب گھرانے کی رہتی —— وہ کا

کو آپ سے دیتی یا آپ کی بات مانتی، جیسا میں مانی —— وہ تو دوسرے اِچ د

ساروں میں بومابوم کر دیتی کی آپ ویسے ہیں —— پھر بولو آپ کی کیا عزت رہ جا

کسی جگہ، کسی محفل میں آپ موتہہ دکھانے کے خابل نہ رہ جاتے —— ہور پھر آپ ک

نہ ہوتی تو سارا مال جائداد تیرے میرے کو بھیک میں چلا جاتا —— یہ سوب تو ہوا

—— ایک بات ہور بولوں کیا —— ؟؟ آپ تو دُنیا کے سوب مزے لُوٹ کو بیٹھے، پھ

سے اپنی شادی رچالئے —— میں کون سا قصور کری تھی کی اتنی لمبی سزا ملی —— د

گندم کا دانہ کھائے تھے —— میں بھی کھائے —— جنت سے نکالے گئے پر یہ د

کیا کم جنت ہے —— میرے کو بھی اگر آپ اپنی جنت سے نکال دیئے تو باہر کی د

جنت سے اب کم نہیں لگیں گی میرے کو —— مگر میرے کو معلوم ہے آپ ایسا نئیں

گے، کیوں کہ اگر آپ میرے کو نکال دیئے تو امّی حضور پھر آپ کو دوسری شادی کر

بولیں گے، ہور لیا آپ دیکھو تو میں آپ کا اِچ غرور سنبھال کو رکھنے کو یہ سب کری

اور انہوں نے بڑی ادا سے ناک سکوڑ کر وجاہت نواب کو دیکھا ——

ناک میں ڈھائی تولے کی نتھ جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔

نواب وجاہت کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس غرور کو اس طرح سنبھالے رکھنے پر

دلہن کی لاتوں اور گھونسوں سے تواضع کریں یا انہیں شاباشی دیں ——